مطالعہ قرآن حکیم کا منتخب نصاب

۱۷ درس

سورۃ الصّف

جہاد و قتال فی سبیل اللہ کے موضوع پر قرآن حکیم کی جامع ترین سورت

ڈاکٹر اسرار احمد

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

اس کتابچے کی اشاعت وطباعت کی ہر شخص کو کھلی اجازت ہے

نام کتابچہ ——— سورۃ الصّف (درس ۱۷)

طبع اوّل (اپریل 2001ء) ——— 1100

طبع دوم (فروری 2005ء) ——— 1100

ناشر ——— ناظم نشرواشاعت' مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

مقامِ اشاعت ——— 36۔ کے' ماڈل ٹاؤن' لاہور

فون: 03-5869501

مطبع ——— شرکت پرنٹنگ پریس' لاہور

قیمت ——— 24 روپے

جہاد و قتال فی سبیل اللہ کے موضوع پر

قرآن حکیم کی جامع ترین سورۃ

سُورۃ الصَّف

مطالعہ قرآن حکیم کے جس منتخب نصاب کا سلسلہ وار مطالعہ ہم کر رہے ہیں اس کے چوتھے حصے میں سورۃ الحج کے آخری رکوع کے بعد اب ہمیں بالترتیب سورۃ الصف اور سورۃ الجمعہ کا مطالعہ کرنا ہے۔ یہ دونوں سورتیں ایک حسین و جمیل جوڑے کی صورت میں "سلسلۂ مُسَبِّحات" کے بالکل وسط میں وارد ہوئی ہیں۔ اس سے قبل سورۃ التحریم کے درس کے ضمن میں بھی یہ بات عرض کی جا چکی ہے کہ قرآن مجید کی اکثر سورتیں جوڑوں کی شکل میں ہیں۔ کسی ایک مضمون پر، جس کے دو رُخ یا دو پہلو ہوں، بالعموم دو علیحدہ سورتوں میں بحث ہوتی ہے۔ اور دونوں سورتیں مل کر اس ایک مضمون کی تکمیل کرتی ہیں۔

قرآن حکیم کی سورتیں اور آیات

اس مرحلے پر چونکہ ہم قرآن حکیم کی ایسی دو سورتوں کا مطالعہ کرنے والے ہیں جن کا باہم جوڑا ہونا بہت نمایاں ہے لہٰذا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس موقع پر مصحف کی ترتیب سے متعلق اور سورتوں کی گروپ بندی (Grouping) کے بارے میں کچھ بنیادی باتیں عرض کر دی جائیں، تاکہ قرآن مجید کے ساتھ ایک مجموعی اور عمومی تعارف اور اس کے ساتھ ایک ذہنی مناسبت پیدا ہونے میں مدد مل سکے۔

اس سے پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ قرآن مجید کی اکائی "آیت" ہے اور قرآن حکیم

چھ ہزار سے زائد آیات پر مشتمل ہے۔ آیت کے معنی ہیں نشانی۔ اس لفظ سے دراصل اس حقیقت کی جانب رہنمائی ملتی ہے کہ قرآن حکیم کی ہر آیت علم و حکمت کا ایک موتی اور اللہ کے علمِ کامل اور اس کی حکمتِ بالغہ کی نشانی ہے۔ بعض آیات صرف حروفِ مقطعات پر مشتمل ہیں، بعض مرکّباتِ ناقصہ پر مشتمل ہیں۔ اسی طرح بہت سی آیات ایسی ہیں جو مکمل جملوں پر مشتمل ہیں، جبکہ ایسی بھی بہت سی آیات ہیں جن میں متعدد جملے آ جاتے ہیں۔ یہ معاملہ کسی لغوی، نحوی یا اجتہادی اصول پر مبنی نہیں ہے، بلکہ درحقیقت یہ تمام امور توقیفی ہیں، یعنی نبی اکرم ﷺ کے بتانے ہی سے امت کو معلوم ہوئے ہیں۔ آیات جمع ہو کر سورتوں کی شکل اختیار کرتی ہیں۔ سورتوں کی کل تعداد ایک سو چودہ ہے جو متفق علیہ ہے۔ "سورۃ" کے لغوی معنی فصیل کے ہیں۔ اس لفظ کے استعمال سے گویا یہ نقشہ سامنے لے آیا گیا کہ قرآن حکیم کی ہر سورۃ علم و حکمت کا ایک شہر ہے، جس کے گرد ایک فصیل موجود ہے۔ آیات ہی کی طرح سورتیں چھوٹی بھی ہیں بڑی بھی ہیں۔ سب سے چھوٹی سورتیں تین ہیں جو تین تین آیات پر مشتمل ہیں۔ انہی میں سے ایک سورۃ العصر ہے جو ہمارے اس منتخب نصاب کا نقطۂ آغاز ہے۔ بقیہ دو سورتیں، سورۃ الکوثر اور سورۃ النصر ہیں۔ قرآن حکیم کی طویل ترین سورتیں وہ ہیں جو سورۃ الفاتحہ کے بعد مصحف کے بالکل آغاز میں آئی ہیں۔ یعنی سورۃ البقرۃ، سورۃ آل عمران، سورۃ النساء، سورۃ المائدۃ، سورۃ الانعام اور سورۃ الاعراف۔ سورتوں کی ترتیب بھی توقیفی ہے۔ بعض سورتیں وہ ہیں جو بیک وقت ایک مربوط اور مسلسل خطبے کی شکل میں نازل ہوئیں، لیکن بہت سی سورتوں میں تدوین و ترتیب کا معاملہ بھی ہوا ہے جو نبی اکرم ﷺ کے حکم کے تحت ہوا ہے کہ بعض آیات نازل ہوئیں اور حضور ﷺ نے فرمایا ان آیات کو فلاں سورۃ میں فلاں آیتوں کے بعد رکھ دو! بہرحال یہ ترتیب اللہ کے حکم سے حضرت جبرئیل علیہ السلام کی رہنمائی میں نبی اکرم ﷺ نے خود معین فرمائی۔

سات احزاب

سورتوں کی ایک تقسیم جو بہت معروف ہے وہ ان کے زمانۂ نزول کے حوالے سے

ہے۔ کچھ سورتیں مدنی ہیں' کچھ مکی ہیں۔ یعنی کچھ سورتیں وہ ہیں جو ہجرت سے قبل نازل ہوئیں اور کچھ سورتیں وہ ہیں جو ہجرت کے بعد نازل ہوئیں۔

اب ترتیب مصحف کی طرف آیئے اور سورتوں کی گروپنگ کو سمجھنے کی کوشش کیجئے! یہ تو ظاہر ہے کہ قرآن مجید کی ترتیب' جس سے ہم واقف ہیں اور جو دورِ نبویؐ سے چلی آ رہی ہے' ترتیبِ نزولی کے اعتبار سے نہیں ہے۔ یہ بات اظہر من الشمس ہے' اس پر کچھ مزید عرض کرنے کی حاجت نہیں ہے۔ اس ترتیبِ مصحف میں سورتیں جس طرح ایک دوسرے کے بعد رکھی گئی ہیں اور ان میں جو گروپ بندی کی گئی ہے ان میں سے ایک گروپ بندی (Grouping) تو وہ ہے جس کا ذکر ہمیں دورِ نبویؐ اور دورِ صحابہؓ سے ملتا ہے' جس کی رُو سے قرآن حکیم کی سورتیں سات احزاب یا سات منزلوں میں منقسم ہیں۔ یہ درحقیقت بغرضِ تلاوت قرآن حکیم کو سات قریباً مساوی حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ اس لئے کہ آغاز میں تقریباً ہر مسلمان ہر ہفتے قرآن مجید کی تلاوت مکمل کیا کرتا تھا لہٰذا ضرورت محسوس ہوئی کہ قرآن حکیم کو سات تقریباً مساوی حصوں میں تقسیم کر دیا جائے' تاکہ ایک شخص روزانہ ایک حصہ' ایک حزب یا ایک منزل پڑھ کر ایک ہفتے میں قرآن مجید ختم کر لیا کرے۔ یہ تقسیم جیسا کہ عرض کیا گیا' دورِ صحابہؓ میں موجود تھی۔ اس تقسیم میں ایک ظاہری حسن بھی پیدا ہو گیا ہے۔ سورۃ الفاتحہ کو چھوڑ کر کہ وہ پورے قرآن مجید کے لئے ایک دیباچے اور مقدمے کی حیثیت رکھتی ہے' پہلا حزب یا پہلی منزل تین سورتوں پر مشتمل ہے' دوسرا پانچ سورتوں پر' تیسرا حزب سات سورتوں پر' چوتھا نو پر' پانچواں گیارہ پر' چھٹا تیرہ سورتوں پر اور اس کے بعد ساتواں "حزبِ مفصل" کہلاتا ہے۔ اس میں سورتوں کی تعداد بہت زیادہ ہے' اس لئے کہ قرآن مجید کے آخر میں حجم کے اعتبار سے بہت چھوٹی چھوٹی سورتیں جمع ہیں۔

پارے اور رکوع

سات منزلیں یا سات احزاب تو دورِ نبویؐ اور دورِ صحابہؓ میں موجود تھے' البتہ دو تقسیمیں بعد میں کی گئی ہیں جن کا دورِ نبویؐ اور دورِ صحابہؓ میں ذکر نہیں ملتا۔ ایک قرآن

حکیم کی تیس پاروں میں تقسیم' جو درحقیقت اس دور کی تجویز کردہ ہے جب مسلمانوں کا جذبۂ ایمان کچھ مدہم پڑ گیا تھا اور تلاوتِ قران کے ضمن میں وہ سابقہ معمول' کہ ہر ہفتے میں قرآن مجید ختم کر لیا جائے' اب کچھ لوگوں پر گراں گزر رہا تھا۔ چنانچہ اس بات کی ضرورت محسوس کی گئی کہ قرآن مجید کو تیس حصوں میں تقسیم کر دیا جائے' تاکہ ہر مسلمان روزانہ ایک حصّہ پڑھ کر ایک مہینے میں تلاوتِ قرآن مکمل کر لیا کرے۔ لیکن یہ تقسیم فی الواقع بڑی ہی مصنوعی اور arbitrary ہے اور قطعی طور پر کسی بھی اصول پر مبنی نہیں ہے۔ یہاں تک کہ اس میں یہ ظلم بھی کیا گیا ہے کہ سورتوں کی فصیلیں توڑ دی گئی ہیں اور نہایت بھونڈے طریقے سے توڑی گئی ہیں۔ مثلاً سورۃ الحجر کی ایک آیت تیرہویں پارے میں جبکہ بقیہ پوری سورۃ چودھویں پارے میں چلی گئی ہے۔ ایسے محسوس ہوتا ہے کہ کسی کے پاس قرآن حکیم کا کوئی ایک نسخہ تھا اور اس نے اس کے صفحات گن کر اسے برابر برابر تیس حصّوں میں تقسیم کر دیا۔ یہی وجہ ہے کہ عرب ممالک میں جو قرآن مجید طبع ہوتے ہیں ان میں بالعموم ان پاروں کا سرے سے کوئی ذکر ہی نہیں ہوتا۔

ایک دوسری تقسیم جو کی گئی' اور وہ بھی بغرضِ سہولت تلاوت کی گئی تھی' وہ ہے سورتوں کی تقسیم رکوعوں میں۔ اس میں پیش نظر یہ تھا کہ طویل سورتوں کو جن کا نماز کی ایک رکعت میں پڑھنا مشکل ہے' اس طرح کے حصوں میں تقسیم کر دیا جائے کہ ایک حصّہ ایک رکعت میں بآسانی پڑھا جا سکے۔ اس طرح طویل سورتیں رکوعوں میں منقسم ہو گئیں۔ آخری پارے کی اکثر سورتیں صرف ایک ایک رکوع پر مشتمل ہیں' اس لئے کہ ان کو ایک رکعت میں بآسانی پڑھا جا سکتا ہے۔ اس کے بعد پیچھے کی طرف آیئے تو ذرا طویل سورتیں ہیں جو دو دو رکوعوں کی سورتیں ہیں۔ پھر مزید طویل سورتیں ہیں جو تین تین اور چار چار رکوعوں پر مشتمل ہیں۔ یہاں تک کہ قرآن حکیم کی طویل ترین سورۃ' سورۃ البقرۃ ہے جو چالیس رکوعوں پر مشتمل ہے۔ یہ تقسیم جس نے بھی کی ہے یہ ماننا پڑتا ہے کہ اس نے مضامین کا لحاظ رکھا ہے۔ عام طور پر رکوع کا اختتام ایسے ہی موقع پر کیا گیا ہے کہ جہاں ایک مضمون مکمل ہو جائے اور سلسلۂ کلام ٹوٹنے نہ پائے۔ بہرحال پاروں اور رکوعوں کی یہ تقسیم دورِ صحابہؓ میں موجود نہیں تھی' یہ بعد کے زمانے سے متعلق ہے۔

سورتوں کی ایک نئی گروپ بندی

البتہ قرآن حکیم کی سورتوں کی ایک گروپنگ (Grouping) اور بھی ہے جس کی جانب ماضی قریب ہی میں بعض محققین کی نگاہ گئی ہے۔ انہوں نے قرآن حکیم میں اس حقیقت کا مشاہدہ کیا کہ مکی اور مدنی سورتوں کو کچھ اس طرح آپس میں جوڑا گیا ہے' اکٹھا کیا گیا ہے کہ اس سے سات گروپ وجود میں آ گئے ہیں۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ قرآن حکیم کی سورتوں کے ہر گروپ کا اغاز ایک یا ایک سے زائد مکی سورتوں سے ہوتا ہے اور اس کا اختتام ایک یا ایک سے زائد مدنی سورتوں پر ہوتا ہے۔ اور اس طرح مکی اور مدنی سورتیں مل کر ایک گروپ کو مکمل کرتی ہیں۔ ایک گروپ کے مکمل ہونے پر آپ دیکھیں گے کہ دوسرا گروپ شروع ہو گا' پھر آغاز میں مکّیات آئیں گی اور ان کے بعد پھر مدنیات۔ اور اس طرح دوسرا گروپ مکمل ہو جائے گا۔ پھر تیسرے گروپ کا آغاز بھی ایک یا ایک سے زائد مکّی سورتوں سے ہو گا جن کے بعد پھر مدنی سورتیں آئیں گی اور گروپ مکمل ہو جائے گا۔ اس طرح مکی اور مدنی سورتوں کے بھی سات ہی گروپ سامنے آتے ہیں۔ ان میں سے ہر گروپ کا ایک مرکزی مضمون ہے جو اس گروپ میں شامل مکی اور مدنی سورتوں میں قدر مشترک کی حیثیت رکھتا ہے۔ یا یوں کہئے کہ ہر گروپ کا ایک مرکزی خیال یا ایک عمود (Central Axis) ہوتا ہے جس کے ساتھ اس گروپ کی تمام مکّی اور مدنی سورتیں مربوط ہوتی ہیں۔

اس طریقے سے قرآن مجید کی سورتوں کے جو سات گروپ وجود میں آئے ہیں ان میں سے پہلے گروپ میں مکی سورۃ صرف ایک ہے' یعنی سورۃ الفاتحہ' جبکہ اس گروپ میں چار انتہائی طویل مدنی سورتیں شامل ہیں' یعنی البقرۃ' آل عمران' النساء اور المائدۃ۔ دوسرا گروپ اس اعتبار سے متوازن ہے کہ اس میں دو سورتیں مکی اور دو ہی مدنی سورتیں شامل ہیں۔ سورۃ الانعام اور سورۃ الاعراف مکی ہیں اور سورۃ الانفال اور سورۃ التوبۃ مدنی ہیں۔ تیسرے گروپ کی مکّیات کا سلسلہ بہت طویل ہے جو گیارہویں پارے میں سورۂ یونس سے شروع ہو کر اٹھارہویں پارے تک چلا گیا ہے۔ اس کے بعد ایک مدنی سورۃ آتی ہے' یعنی سورۃ النور' اور اس پر گروپ مکمل ہو جاتا ہے۔ پھر مکّیات کا سلسلہ

سورۃ الفرقان سے شروع ہو کر بائیسویں پارے تک چلا گیا ہے جس کے بعد سورۃ الاحزاب مدنی سورۃ ہے جس پر چوتھا گروپ مکمل ہوتا ہے۔ اس طرح سے مکیات اور مدنیات پر مشتمل قرآن حکیم کی سورتوں کے سات گروپ وجود میں آتے ہیں کہ جن میں ایک معنوی تقسیم بھی نظر آتی ہے کہ ہر گروپ کا اپنا ایک مرکزی مضمون ہے جس کی تکمیل اس گروپ میں شامل مکی اور اور مدنی سورتیں مل کر کرتی ہیں۔

مدنی سورتوں کا سب سے بڑا گلدستہ

اب آیئے اس اصل موضوع کی طرف جس کے ضمن میں یہ ساری بات زیر بحث آئی ہے۔ اور وہ یہ کہ اس پہلو سے قرآن حکیم کی سورتوں کا جو چھٹا گروپ بنتا ہے اس میں سورۃ الصّف اور سورۃ الجمعہ شامل ہیں۔ یہ گروپ بعض اعتبارات سے ایک خصوصی شان کا حامل ہے۔ اس کے آغاز میں سورۂ ق سے سورۃ الواقعہ تک سات مکی سورتیں ہیں۔ قرآن مجید کی تلاوت کرنے والے جانتے ہیں کہ آہنگ (Rhythm) اور روانی کے اعتبار سے قرآن حکیم میں ان سورتوں کو ایک امتیازی مقام حاصل ہے۔ ان سب کا مرکزی مضمون ہے آخرت اور اسی پر مختلف پہلوؤں سے ان سورتوں میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ انہی میں سورۃ الرحمٰن بھی شامل ہے جسے "عروس القرآن" کہا گیا ہے۔ الفاظ کا حسن اور تراکیب اور بندشوں کی بے مثل خوبصورتی اور اچھوتا پن ان سورتوں کا امتیازی اور مشترک وصف ہے۔

ان سات مکی سورتوں کے بعد اس گروپ میں دس مدنی سورتیں شامل ہیں۔ بلحاظِ تعداد مدنی سورتوں کا یہ سب سے بڑا اور خوبصورت اکٹھ (Constellation) ہے جس کی کوئی اور نظیر قرآن حکیم میں موجود نہیں۔ ویسے حجم کے اعتبار سے پہلے گروپ میں جو چار مدنی سورتیں یعنی البقرۃ، آل عمران، النساء اور المائدۃ شامل ہیں، وہ بہت طویل ہیں۔ لیکن بہرحال سورتوں کی تعداد وہاں چار ہی ہے، جبکہ یہاں دس مدنی سورتیں مسلسل وارد ہوئی ہیں۔ ستائیسویں پارے کی سورۃ الحدید سے ان کا سلسلہ شروع ہوتا ہے اور اٹھائیسویں پارے کی آخری سورۃ، سورۃ التحریم پر ختم ہوتا ہے۔

زیرِ نظر مدنی سورتوں کے مشترک اوصاف

ان سورتوں میں کچھ چیزیں قدرِ مشترک کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اور چونکہ مطالعۂ قرآن حکیم کے اس منتخب نصاب میں مکمل سورتوں کی سب سے بڑی تعداد اسی گروپ سے ہے لہٰذا اس نصاب کے مضامین کی تفہیم کے لئے اس گروپ میں شامل سورتوں کے مشترک امور کو سمجھ لینا مفید ہو گا۔ اس سے پہلے اس گروپ کی دو سورتیں ہم پڑھ چکے ہیں۔ منتخب نصاب کے حصّہ دوم میں' جو مباحث ایمان پر مشتمل ہے' ہم نے سورۃ التغابن کا مطالعہ کیا تھا جو اس گروپ میں شامل ہے۔ اسی طرح حصّہ سوم میں اعمالِ صالحہ کی تفصیل کے ضمن میں عائلی زندگی اور اس سے متعلق اہم ہدایات پر مشتمل سورۃ التحریم کا ہم مطالعہ کر چکے ہیں جو اس گروپ کی آخری سورۃ ہے۔ اب اس مرحلہ پر اسی گروپ کی دو مزید سورتوں یعنی سورۃ الجمعہ اور سورۃ الصف کا مطالعہ ہم کرنے والے ہیں۔ مزید برآں ہمارے اس منتخب نصاب کے آخری حصے میں ہمیں سورۃ الحدید کا مطالعہ کرنا ہے جس سے اس گروپ کی مدنی سورتوں کا آغاز ہوتا ہے۔ لہٰذا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس مرحلے پر ان سورتوں کے بارے میں بعض بنیادی باتیں ذہن نشین کر لی جائیں تاکہ ہر مرحلے پر ان کے تکرار و اعادہ کی ضرورت نہ رہے۔

تمام خطاب اُمّتِ مُسلمہ سے ہے!

پہلی چیز جو ان دس سورتوں میں قدرِ مشترک کی حیثیت رکھتی ہے' یہ ہے کہ تقریباً ان سب کا زمانہ نزول مدنی دور کا نصفِ آخر ہے۔ یہ وہ دور ہے جب مسلمانوں کا معاشرہ باقاعدہ وجود میں آچکا تھا اور مسلمانوں کو غلبہ اور اقتدار بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا ہو چکا تھا۔ گویا مسلمانوں کی حکومت قائم ہو چکی تھی۔ چنانچہ آپ دیکھیں گے کہ ان سورتوں میں خطاب کُل کا کُل مسلمانوں سے ہے' بحیثیتِ اُمّتِ مسلمہ۔ ان میں یہود و نصاریٰ سے یا مشرکینِ مکّہ سے خطاب آپ کو نہیں ملے گا' نہ بطرزِ دعوت و تبلیغ نہ بطورِ ملامت و زجر و توبیخ! خطاب کُل کا کل امّتِ مسلمہ سے ہے' اہل کتاب یعنی یہود اور نصاریٰ کا اگر کہیں حوالہ آیا بھی ہے تو محض نشانِ عبرت کے طور پر۔ ان میں بھی نصاریٰ کی طرف

Referenceان سورتوں میں محض دو مقامات پر ہے' جبکہ اکثر سورتوں میں یہود کو بطورِ نشانِ عبرت پیش کیا گیا ہے کہ اے مسلمانو! جس مقام پر آج تم فائز کئے جا رہے ہو اس مقام پر اس سے پہلے بنی اسرائیل فائز تھے۔ تم سے پہلے کتابِ الٰہی کے حامل وہ تھے' انہیں توراۃ عطا کی گئی تھی جس میں ہدایت بھی تھی اور قانون و شریعت بھی' تم سے پہلے وہ قوم اللہ کی نمائندہ امت تھی جسے اڑھائی ہزار برس تک یہ مقامِ بلند حاصل رہا' لیکن جب انہوں نے اللہ کی کتاب اور اس کے دین کے ساتھ غداری کی تو وہ اللہ کے غضب کا نشانہ بنے اور انہیں اس مقام سے معزول کر دیا گیا۔ اس سابقہ امت میں کن کن راستوں سے گمراہیاں آئیں' کس کس پہلو سے ان میں اخلاقی' اعتقادی یا عملی اضمحلال پیدا ہوا' اس کو اپنے سامنے بطورِ نشانِ عبرت رکھو! اس لئے کہ امتوں کی تاریخ ایک دوسرے سے بہت مشابہ ہوتی ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے اس حقیقت کو بڑی وضاحت سے بیان فرمایا ہے۔ آپؐ ارشاد فرماتے ہیں : ((لَيَأْتِيَنَّ عَلٰى أُمَّتِيْ مَا أَتٰى عَلٰى بَنِي إِسْرَائِيْلَ حَذْوَ النَّعْلِ بِالنَّعْلِ)) "میری امت پر بھی وہ تمام حالات وارد ہوں گے جو اس سے پہلے بنی اسرائیل پر آئے ہیں' بالکل ایسے جیسے کہ ایک جوتا دوسرے جوتے سے مشابہ ہوتا ہے"۔ دونوں اُمتوں کے حالات میں مشابہت کے بیان میں اس سے زیادہ بلیغ تمثیل ممکن نہیں۔ آپ نے اس معاملے کو اس کی انتہا تک پہنچانے کے لئے یہ مثال بھی دی کہ اگر وہ (یعنی بنی اسرائیل) گوہ کے بل میں گھسے تھے تو تم بھی ضرور گھسو گے' اور اگر ان میں سے کوئی بدبخت اور شقی ایسا پیدا ہوا کہ اس نے اپنی ماں سے بدکاری کی ہو تو تم میں سے بھی کوئی ایسا بدبخت پیدا ہو کر رہے گا۔ تو ان سورتوں میں درحقیقت اُمّتِ مسلمہ کے سامنے بطورِ نشانِ عبرت یہود اور نصاریٰ کے حالات بار بار لائے گئے۔ اور اس طرح مسلمانوں کو پیشگی متنبہ کیا جا رہا ہے کہ دیکھنا کہیں تم ان گمراہیوں کا شکار نہ ہو جانا!

اہم مضامین کے جامع خلاصے

تیسری قدرِ مشترک ان سورتوں میں یہ ہے کہ ایسے محسوس ہوتا ہے کہ قرآن مجید کے وہ اہم مضامین اور مباحث جو طویل مکی اور مدنی سورتوں میں بہت تفصیل سے آئے

ہیں' ان کے گویا چھوٹے چھوٹے خلاصے نکال کر اس مقام پر جمع کر دیئے گئے ہیں۔ ایمان کے مباحث مکّی سورتوں میں بڑی لمبی بحثوں کی صورت میں پھیلے ہوئے ہیں۔ توحید' معاد اور آخرت کے مباحث اور ان کے لئے دلائل' پھر ان پر وارد شدہ اعتراضات کے جوابات طویل سورتوں میں بڑی تفصیل سے زیر بحث آئے ہیں۔ لیکن جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں ایمان اور اس کے ثمرات و لوازم کے بیان میں اٹھارہ آیات پر مشتمل سورۃ التغابن انتہائی جامع سورۃ ہے۔ کوئی جاننا چاہے کہ ایمان کیا ہے' اس کے لوازم کیا ہیں' اس کے نتائج اور مضمرات کیا ہیں اور اس کے فکری و عملی تقاضے کیا ہیں تو سورۃ التغابن اس کے لئے کفایت کرے گی۔

اسی طرح نفاق کا مضمون طویل مدنی سورتوں میں (یعنی سورۃ النساء' سورۂ آل عمران اور سورۃ التوبہ میں) بڑے طویل مباحث پر پھیلا ہوا ملے گا کہ نفاق کسے کہتے ہیں' اس کی حقیقت کیا ہے' اس کا نقطہ آغاز کون سا ہے' اس مرض کی علامات کیا ہیں' اس کی ہلاکت خیزی کا عالم کیا ہے' اس سے بچاؤ کی تدابیر کیا ہیں' اگر اس کی چھوت لگ جائے تو اس کا علاج کیا ہے' یہ تمام امور ان سورتوں میں بڑی تفصیل سے زیر بحث آئے ہیں۔ لیکن ان تمام مضامین کا ایک جامع خلاصہ اور لُبِّ لباب ہمیں سورۃ المنافقون کی شکل میں عطا کر دیا گیا جو کل گیارہ آیات پر مشتمل ہے اور اسی مجموعے میں شامل ہے۔

اسی طرح عائلی زندگی سے متعلق یہ عرض کیا جا چکا ہے کہ قرآن حکیم میں سب سے زیادہ مفصل ہدایات اسی شعبۂ زندگی کے بارے میں دی گئی ہیں۔ گھر کا ادارہ انسان کی اجتماعی زندگی کی پہلی منزل ہے۔ اس ادارے کو کن خطوط پر استوار کیا جائے' بیویوں اور اولاد کے معاملے میں معتدل اور متوازن طرزِ عمل کون سا ہے' اگر طلاق کی نوبت آ جائے تو کن باتوں کو پیش نظر رکھنا ضروری ہو گا' ان موضوعات پر دو دو رکوعوں پر مشتمل دو انتہائی جامع سورتیں (سورۃ الطلاق اور سورۃ التحریم) بھی اسی گلدستے میں شامل ہیں۔

اس طرح یہ دس سورتیں گویا مختلف اعتبارات سے قرآن حکیم میں طویل بحثوں میں پھیلے ہوئے اہم مباحث کے خلاصوں کی حیثیت رکھتی ہیں جن کو ایک مقام پر یکجا کر دیا گیا ہے۔ اور یہی درحقیقت سبب ہے اس کا کہ ان دس سورتوں میں سے چھ ہمارے اس

منتخب نصاب میں شامل ہیں' یعنی سورۃ الحدید' سورۃ الصّف' سورۃ الجمعہ' سورۃ المنافقون' سورۃ التغابن اور سورۃ التحریم۔

سرزنش اور ملامت کا اسلوب

ایک اور قدرِ مشترک یا وصف مشترک ان سورتوں میں یہ نظر آتا ہے کہ امت مسلمہ سے خطاب میں بالعموم کچھ ملامت کا سا اور جھنجھوڑنے کا سا انداز جھلکتا نظر آتا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے امت کے بعض طبقات کے جذباتِ ایمانی اور جوشِ جہاد میں کچھ کمی واقع ہو گئی تھی' ان کا جذبۂ انفاق کچھ سرد پڑ رہا تھا اور اب انہیں جھنجھوڑا جا رہا ہے' کچھ سرزنش کے انداز میں بھی اور کہیں کہیں ملامت اور زجر کے انداز میں۔ یہ انداز ان تمام سورتوں میں مشترک ہے۔ اس کی بہت سی مثالیں دورانِ مطالعہ ہمارے سامنے آئیں گی۔ سورۃ الصف میں فرمایا گیا : ﴿ لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ﴾ "اے مسلمانو! کیوں کہتے ہو جو کرتے نہیں ہو۔" ﴿ كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ﴾ "یہ چیز اللہ کے غضب کو بھڑکانے والی ہے کہ تم کہو جو کرتے نہیں ہو" ـــــ اسی طرح سورۃ الجمعہ میں ڈانٹ کے سے انداز میں تنبیہہ کی گئی ہے کہ اے نبی' یہ کیا معاملہ ہے کہ آپ کھڑے خطبہ دے رہے تھے اور مسلمان آپ کو چھوڑ کر چلے گئے۔ کیا خطبے اور نمازِ جمعہ کے مقابلے میں کاروبارِ دُنیوی انہیں زیادہ عزیز ہو گیا ہے!! سورۃ الحدید میں یہی انداز ہے : ﴿ اَلَمْ يَاْنِ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ وَمَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ ﴾ "کیا اہلِ ایمان کے لئے ابھی وقت نہیں آیا کہ ان کے دل جُھک جائیں اللہ کی یاد میں اور جو کچھ نازل ہوا ہے اللہ کی طرف سے اس کے سامنے"۔ سورۃ التحریم میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ ایک معاملے میں ازواجِ مطہرات کو سرزنش کی گئی ہے اور کم از کم ظاہر الفاظ کے اعتبار سے اس میں بڑی سختی موجود ہے۔ تو ان سورتوں میں یہ انداز بتکرار ملتا ہے۔

اس پیرایۂ بیان کا اصل سبب

اس ضمن میں یہ بات سمجھ لیجئے کہ واقعہ یہ ہے کہ ایک دَور تو وہ تھا جب کوئی شخص جان اور مال کی بازی کھیل کر ہی کلمۂ شہادت زبان پر لاتا تھا۔ مکّی دَور میں یہی کیفیت تھی۔

ہر شخص جانتا تھا کہ کلمۂ شہادت کے زبان پر جاری ہوتے ہی ہر چہار طرف سے مخالفت کا طوفان اُمڈ پڑے گا' مصائب اور تکالیف کا سامنا ہو گا۔ ہو سکتا ہے اس کشمکش میں گھر بار سے تعلق توڑنا پڑے اور تمام پرانے تعلقات اور دوستیوں کو خیرباد کہنا پڑے۔ لہٰذا کلمۂ شہادت زبان پر لانے کا فیصلہ کوئی شخص اسی وقت کرتا تھا جبکہ ایمان اس کے دل میں پورے طور پر جاگزیں اور راسخ ہو چکا ہوتا۔ لیکن یہ صورتِ حال تدریجاً بدل گئی۔ بالخصوص مدنی دَور کے آخری زمانے کا خیال کیجئے۔ حضور ﷺ کو فیصلہ کن اقتدار حاصل ہے' مسلمانوں کو غلبہ حاصل ہو گیا ہے اور اب وہ ایک حکمران طاقت کی حیثیت رکھتے ہیں' چنانچہ اب زبان سے کلمۂ شہادت ادا کرنا نہ صرف آسان ہو گیا ہے بلکہ یہ کلمہ اب انسان کے جان و مال کے تحفظ کا ضامن بھی ہے۔ لہٰذا اب صورت حال وہ ہو گئی جس کا نقشہ سورۃ النصر میں بایں الفاظ کھینچا گیا ہے : ﴿اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ ۝ وَرَاَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا ۝﴾ تو یہ لوگ جو فوج در فوج اور جوق در جوق دین اسلام میں داخل ہو رہے تھے' ظاہر بات ہے کہ ان کے ایمان کی کیفیت وہ نہیں تھی جو سابقون الاولون کے ایمان کی تھی۔ یہ بات اس سے پہلے سورۃ الحجرات کی آیت ۱۴ میں آ چکی ہے۔ ایسے ہی لوگوں سے مخاطب ہو کر کہا گیا تھا کہ تم یہ نہ کہو کہ ہم ایمان لے آئے' بس یہ کہہ سکتے ہو کہ ہم نے اسلام قبول کر لیا۔ ﴿قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ﴾

اب ظاہر بات ہے جب ایک کثیر تعداد میں ایسے لوگ امت میں شامل ہو گئے تو امت میں بحیثیتِ مجموعی جذباتِ ایمانی' جوشِ جہاد اور جذبۂ انفاق کا اوسط کم ہو گیا۔ یہ وہ اضمحلال ہے جس پر اسی وقت گرفت کی گئی۔ اس میں درحقیقت بعد کے ادوار کے لئے' جبکہ امت میں بحیثیتِ مجموعی اضمحلال اور زوال پوری شدّت کے ساتھ ظاہر ہونے والا تھا' پیشگی رہنمائی کا سامان موجود ہے۔ اور اس طرح آئندہ کے ادوار میں یہ سورتیں مسلمانوں کی غیرتِ ایمانی کو للکارنے اور ان کے جوشِ جہاد اور جذبۂ انفاق کو از سرِ نو تازہ کرنے میں مہمیز کا کام دیں گی۔ ان کی تلاوت سے مسلمانوں میں یہ شعور پیدا ہو گا کہ وہ اپنا جائزہ لیں' اپنے گریبانوں میں جھانکیں اور اگر ایمان کے اضمحلال کی متذکرہ بالا

کیفیات انہیں اپنے باطن میں محسوس ہوں تو اس ضعف و اضمحلال کو دُور کرنے پر کمربستہ ہو جائیں۔

ہمارے لئے ان سورتوں کی خصوصی اہمیت

اس اعتبار سے دیکھا جائے تو اس دَور میں کہ جس میں ہم سانس لے رہے ہیں' امت مسلمہ زوال و انحطاط کی انتہاؤں کو چھو رہی ہے۔ مولانا حالیؔ نے ان دو اشعار میں جو انہوں نے اپنی مسدّس کی پیشانی پر درج کئے ہیں' اس کا بڑا دردناک نقشہ کھینچا تھا :

پستی کا کوئی حد سے گزرنا دیکھے
اسلام کا گر کر نہ ابھرنا دیکھے
مانے نہ کبھی کہ مد ہے ہر جزر کے بعد
دریا کا ہمارے جو اُترنا دیکھے!

اس دَور میں واقعہ یہ ہے کہ اگر ان سورتوں پر امت کی توجہات کو مرتکز کر دیا جائے' ان کا فہم عام کر دیا جائے تو یہ مسلمانوں کے جذبۂ ایمان کی از سرنو بار یابی اور ان کے اندر جوشِ جہاد اور جذبۂ انفاق پیدا کرنے میں ان شاء اللہ العزیز انتہائی مفید اور ممد ثابت ہوں گی۔

المُسَبِّحات

آخری بات ان سورتوں کے بارے میں یہ نوٹ کر لیجئے کہ ان دس سورتوں میں سے پانچ وہ ہیں کہ جن کا آغاز "سَبَّحَ لِلّٰہِ" یا "یُسَبِّحُ لِلّٰہِ" کے الفاظ سے ہوتا ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اس دس کے گل دستے میں یہ پانچ سورتیں ایک اضافی اور نرالی شان کی حامل ہیں۔ ان سورتوں کو مجموعی طور پر "المُسَبِّحات" کا نام دیا گیا ہے۔ یعنی وہ سورتیں جن کا آغاز تسبیح باری تعالیٰ سے ہوتا ہے۔ ان میں سے تین وہ ہیں کہ جن میں آغاز میں "سَبَّحَ لِلّٰہِ" کے الفاظ وارد ہوئے۔ یعنی تسبیح کا ذکر فعل ماضی کی شکل میں کیا گیا ہے' جبکہ دو سورتوں کا آغاز ہوتا ہے "یُسَبِّحُ لِلّٰہِ" کے الفاظ سے۔ یہاں فعل مضارع لایا گیا ہے جو حال اور مستقبل دونوں کو محیط ہے۔ اس معاملے میں بھی ایک عجیب توازن نظر آتا ہے کہ

سورۃ الحشر کی آخری آیت میں بھی یہ لفظ "یُسَبِّحُ" شامل ہے۔ اس طرح گویا تین مرتبہ "سَبَّحَ" اور تین ہی مرتبہ "یُسَبِّحُ" کے الفاظ ان سورتوں میں وارد ہوئے ہیں۔ دورانِ مطالعہ آپ محسوس کریں گے کہ اُمّتِ مسلمہ کو جھنجوڑنے، مسلمانوں کو ان کے فرائضِ دینی سے آگاہ کرنے اور بالخصوص انہیں آمادۂ عمل کرنے میں ان مسبّحات کی تاثیر دوسری سورتوں سے بڑھ کر ہے۔ چنانچہ ان پانچ "مسبّحات" میں سے چار اس منتخب نصاب میں شامل ہیں۔ اس سلسلے کی پہلی سورت سورۃ الحدید ہے۔ وہ یوں سمجھئے کہ ہمارے اس منتخب نصاب کا نقطۂ عروج ہوگی۔ گویا اس کا نقطۂ آغاز اگر سورۃ العصر ہے تو اس کی چوٹی (Climax) سورۃ الحدید ہے۔ یا یوں کہہ لیجئے کہ شجرِ ہدایت کا بیج اگر سورۃ العصر ہے تو اس کا پھل ہے سورۃ الحدید، جس پر ہمارا یہ منتخب نصاب ان شاء اللہ تکمیل پذیر ہوگا۔ یہ چند باتیں اگر ذہن نشین کرلی جائیں تو امید ہے کہ قرآن مجید سے ایک عمومی تعارف میں بھی ممدّ و معاون ہوں گی اور خاص طور پر ان سورتوں کی اہمیت کو سمجھنے میں ان سے مدد ملے گی۔ ان شاء اللہ

چند تمہیدی مباحث

سورۃ الصّف اور سورۃ الجُمُعہ کا براہِ راست مطالعہ کرنے سے قبل قرآن حکیم کی سورتوں کے بارے میں تعارفی و تمہیدی نوعیت کی دو مزید باتوں کی جانب توجّہ کرنا مفید رہے گا۔ اجمالاً ان امور کی جانب اشارات پچھلے اسباق میں بھی کئے جا چکے ہیں۔ ایک یہ کہ جس طرح ہر گروپ کا ایک مرکزی مضمون ہوتا ہے اسی طرح قرآن حکیم کی ہر سورۃ کا ایک عمود یا Axis ہوتا ہے، جسے ایک ایسے دھاگے سے مشابہہ قرار دیا جاسکتا ہے جس میں موتی پروئے گئے ہوں اور ان موتیوں کو ہار کی شکل دی گئی ہو۔

قرآن حکیم کی ہر آیت اپنی جگہ علم و حکمت کا ایک حسین موتی ہے۔ لیکن جب اسے ایک سلسلۂ کلام کی لڑی میں پرو دیا جاتا ہے، ایک مرکزی مضمون کے ساتھ اس کا ربط قائم ہوتا ہے تو اس کے حسن میں ایک نئی شان پیدا ہوتی ہے اور اس ربط باہم سے علم و حکمت کے نئے نئے پہلو آشکارا ہوتے ہیں۔ اس اعتبار سے قرآن حکیم کی ہر سورۃ پر غور کرنے کے لئے اس سورۃ کے مرکزی مضمون اور عمود کا تعیّن ضروری ہے۔ پھر ہر آیت پر اپنی

جگہ غور کرنے کے بعد اس مرکزی مضمون کے ساتھ ان آیات کے ربط کو تلاش کرنا تدبّرِ قرآن کے نقطۂ نگاہ سے نہایت اہم ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ قرآن حکیم کی اکثر سورتیں جوڑوں کی شکل میں ہیں۔ قرآن حکیم میں یہ اسلوب نظر آتا ہے کہ کسی ایک مضمون کو جس کے دو رُخ یا دو پہلو ہوں، کسی ایک ہی سورۃ میں بیان کرنے کی بجائے بالعموم دو سورتوں میں منقسم کر دیا جاتا ہے اور وہ دو سورتیں گویا ایک جوڑے (Pair) کی صورت اختیار کر لیتی ہیں۔ اس مضمون کے ایک پہلو پر گفتگو اس جوڑے میں شامل ایک سورۃ میں اور دوسری پر بحث دوسری سورۃ میں ہوتی ہے۔ اور جیسے کہ محاورتاً کہا جاتا ہے کہ ہر تصویر کے دو رُخ ہوتے ہیں اور ان کے اجتماع سے تصویر مکمل ہوتی ہے، اسی طرح دونوں سورتیں مل کر ایک مضمون کی تکمیل کرتی ہیں۔

اس کی ایک نمایاں مثال "معوّذتین" کی ہے جو قرآن حکیم کی آخری دو سورتیں ہیں۔ ان کا مضمون ایک ہی ہے یعنی "تعوّذ"۔ ان چیزوں کو کہ جن سے اللہ کی پناہ طلب کرنے کی تلقین کی گئی ہے، دو حصّوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ ایک وہ آفات ہیں جو انسان پر خارج سے حملہ آور ہوتی ہیں اور بعض وہ ہیں جو انسان کے اپنے باطن سے ابھرتی ہیں۔ پہلی قسم کی آفات سے سورۃ الفلق میں اللہ کی پناہ حاصل کرنے کا ذکر ہے اور دوسری نوع کی آفات سے سورۃ الناس میں۔ اس طرح سے "معوّذتین" کی شکل میں قرآن حکیم کی سورتوں کا ایک حسین و جمیل جوڑا وجود میں آگیا۔

اسی طرح کا معاملہ سورۃ المزّمّل اور سورۃ المدّثّر کا ہے۔ ان دونوں سورتوں کے ناموں میں بھی لفظی مشابہت موجود ہے اور مضامین کے اعتبار سے بھی گہری مماثلت نظر آتی ہے۔ ایک میں نبی اکرم ﷺ کو قیام اللّیل کی شکل میں ذاتی ریاضت کا حکم دیا جا رہا ہے: ﴿یٰٓاَیُّهَا الْمُزَّمِّلُ ۝ قُمِ الَّیْلَ اِلَّا قَلِیْلًا ۝﴾ یہ آپ کی ذاتی تربیت کے لئے ضروری ہے۔ اس لئے کہ: ﴿اِنَّا سَنُلْقِیْ عَلَیْكَ قَوْلًا ثَقِیْلًا ۝﴾ "ہم آپ پر بڑی بھاری بات ڈالنے والے ہیں"۔ اس کے لئے آپ ﷺ کو ذاتی تربیت کے اس مرحلے سے گزرنا ہو گا۔ اور دوسری سورۃ میں اس مشن کے لئے کھڑے ہونے کا ذکر ہے کہ جس کے لئے آپؐ

کو بھیجا گیا تھا اور جس کے لئے یہ ساری تیاری درکار تھی۔ فرمایا گیا: ﴿یٰٓاَیُّهَا الْمُدَّثِّرُ ۝ قُمْ فَاَنْذِرْ ۝ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ۝﴾ کہ اب اپنے mission کی تکمیل کے لئے کھڑے ہو جائیے' اپنی جِدّوجُہد کا آغاز کیجئے' اور اللہ کی کبریائی کا اعلان کیجئے! چنانچہ یہ دونوں سورتیں مل کر ایک حسین و جمیل جوڑے کی صورت اختیار کرتی ہیں۔

یہ دو مثالیں ان سورتوں سے متعلق تھیں جن کا باہم جوڑا ہونا بہت نمایاں ہے۔ ان کے علاوہ بھی بہت سی سورتیں ایسی ہیں جن کا باہم جوڑا ہونا بڑی آسانی سے سمجھ میں آتا ہے۔ مثلاً اٹھائیسویں پارے کے آخر میں دو سورتیں سورۃ التحریم اور سورۃ الطلاق ایک انتہائی خوبصورت جوڑے کی شکل میں ہیں۔ یہ دونوں سورتیں عائلی زندگی کے دو مختلف پہلوؤں اور ان سے متعلقہ مسائل سے بحث کرتی ہیں۔ ایک پہلو شوہر اور بیوی کے مابین عدم موافقت سے متعلق ہے جس کی انتہا طلاق ہے۔ اور دوسرے کا تعلق شوہر اور بیوی کے مابین محبّت و الفت سے ہے' جو اگرچہ مطلوب اور پسندیدہ ہے' لیکن اگر یہ معاملہ حد اعتدال سے تجاوز کر جائے اور ایک دوسرے کے جذبات کا لحاظ اس حد تک کیا جانے لگے کہ حدود اللہ ٹوٹنے لگیں تو یہ دوسری انتہا ہے۔ سورۃ الطّلاق میں ایک انتہا سے بحث ہوئی اور سورۃ التحریم میں دوسری انتہا زیر بحث آئی۔

اسی طرح کا معاملہ سورۃ المنافقون اور سورۃ التّغابن کا ہے۔ یہ دونوں سورتیں ہمارے اس منتخب نصاب میں شامل ہیں۔ ایمانِ حقیقی اور اس کے ثمرات و مضمرات کے موضوع پر سورۃ التغابن قرآن حکیم کی جامع ترین سورۃ ہے۔ اگرچہ قانونی سطح پر ایمان کے مقابل کا لفظ "کفر" ہے' لیکن حقیقی اعتبار سے ایمان کے مقابل کا لفظ "نفاق" ہے۔ نفاق دراصل فقدانِ ایمان کی باطنی کیفیت کا نام ہے۔ چنانچہ مصحف میں سورۃ التغابن سے متصلاً قبل جڑی ہوئی سورۃ المنافقون موجود ہے جو نفاق کے موضوع پر قرآن حکیم کی جامع ترین سورۃ ہے۔ نفاق کے اسباب اور اس کے نقطۂ آغاز سے لے کر اس کے انجام اور اس کے علاج تک تمام اہم مباحث اس ایک چھوٹی سی سورۃ میں جمع ہیں۔ سورۃ التغابن اور سورۃ المنافقون دونوں کو مصحف میں یکجا کر دیا گیا اور اس طرح ایک مضمون کی تکمیل ہو گئی۔

بعثتِ نبویؐ کے دو اہم پہلو

باہم جوڑا ہونے کی یہ نسبت سورۃ الصّف اور سورۃ الجمعہ میں بھی بہت نمایاں ہے۔ بعثتِ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسّلام کے دو رُخ چونکہ ان دو سورتوں میں زیر بحث آئے ہیں لہٰذا میرا احساس یہ ہے کہ ان پر غور و فکر کرنے والا ہر شخص اپنے باطن میں ان سورتوں کے ساتھ قلبی اور ذہنی مناسبت کی ایک عجیب اور نرالی کیفیت محسوس کرتا ہے۔ ایک سورت یعنی سورۃ الصّف کا مرکزی مضمون یہ ہے کہ حضور ﷺ کا مقصد بعثت کیا ہے! یہ موضوع اپنی جگہ نہایت اہم ہے' اس لئے کہ کسی بھی شخص کے کارنامۂ حیات کو assess کرنے (جانچنے) کے لئے ضروری ہے کہ پہلے یہ متعین کیا جائے کہ اس کا ہدف کیا تھا' وہ کیا کرنے چلا تھا اور اس کی منزلِ مقصود کون سی تھی۔ اس پہلو سے سیرتِ محمدیؐ کے مطالعے کے لئے واقعتاً یہ سورۂ مبارکہ اور بالخصوص اس کی مرکزی آیت انتہائی اہمیت کی حامل ہے' کہ یہ سمجھا جائے کہ حضور نبی اکرم ﷺ کا مقصدِ بعثت کیا تھا' اور آپؐ کا فرضِ منصبی کیا تھا! یہ ہے مرکزی مضمون سورۃ الصّف کا۔ چنانچہ ہم دیکھیں گے کہ اس سورۂ مبارکہ میں تفصیل سے یہ مباحث آئے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ کے اس فرضِ منصبی کا تقاضا ہے کہ جو بھی اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لانے والے ہیں ان کا فرض ہے کہ وہ اس جِدّوجُہد میں رسولؐ کا ہاتھ بٹائیں' رسولؐ کے دست و بازو بنیں' ان کے مشن کی تکمیل میں اپنی جان اور مال' اپنی قوتوں اور صلاحیتوں کو صرف کر دیں اور اگر ضرورت پڑے اور وقت آئے تو اس راہ میں اپنی جان بھی نچھاور کر دیں۔ یہ گویا ان کے ایمان کی صداقت کی دلیل ہوگی۔ اس پہلو سے واقعہ یہ ہے کہ اس سورۃ الصّف میں جہاد و قتال فی سبیل اللہ کا مضمون اپنی منطقی انتہا اور اپنے مرتبۂ کمال کو پہنچ گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس سورۂ مبارکہ کو منتخب نصاب کے اس چوتھے حصّے میں رکھا گیا ہے جو "تواصی بالحق" کی تشریحات پر مشتمل ہے اور جس کا جامع عنوان ہے "جہاد فی سبیل اللہ"۔

ذہن میں رہے کہ اس منتخب نصاب میں جہاد کی بحث کا آغاز سورۃ الحجرات کی آیت ۱۴ سے ہوا تھا: ﴿قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ﴾ پھر آیت ۱۵ میں ایمانِ حقیقی کی تعریف (definition) ان الفاظ

میں آئی : ﴿ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ ثُمَّ لَمْ یَرْتَابُوْا وَجٰھَدُوْا بِاَمْوَالِھِمْ وَاَنْفُسِھِمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ ﴾ جہاد فی سبیل اللہ کا ہدفِ اوّلین یا اس کی ابتدائی منزل کا ذکر سورۃ الحج کی آخری آیت کے حوالے سے ہمارے سامنے آچکا ہے۔ یعنی دعوت و تبلیغ کا فریضہ ادا کرنا' لوگوں پر اتمامِ حجت کرنا یا بالفاظِ دیگر "شہادت علی النّاس" کا فریضہ ادا کرنا جہاد فی سبیل اللہ کا اوّلین ہدف ہے۔ اسی جہاد فی سبیل اللہ کی آخری منزل' اس کی غایتِ قصویٰ یا اس کا ہدفِ آخریں ہے اللہ کے دین کا غلبہ۔ اور یہ ہے وہ اہم مضمون جو اس سورۃ الصّف میں ہمارے سامنے آئے گا۔

بعثتِ نبویؐ کا دوسرا رُخ یہ ہے کہ وہ اساسی منہج عمل اور وہ بنیادی طریق کار کون سا تھا جس پر عمل پیرا ہو کر محمدؐ رسول اللہ ﷺ نے اپنے اس فرضِ منصبی کو ادا کیا اور اپنے اس مشن کی تکمیل کی جس کا تعین سورۃ الصّف میں کیا گیا ہے۔ یہ ہے مرکزی مضمون سورۃ الجمعہ کا۔ اس پہلو سے سیرتِ نبوی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے مطالعے میں ان دونوں سورتوں کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ ان دونوں سورتوں نے مل کر گویا ایک مضمون کی تکمیل کر دی کہ نبی اکرم ﷺ کا مقصدِ بعثت کیا تھا' اور اس کے لئے آپؐ کا اساسی طریق کار اور بنیادی منہج عمل کون سا تھا!

مقصد کا تعیّن اور صحیح منہج عمل کی تعیین

یہاں ایک بات کی جانب توجّہ دلانا غیر مفید نہ ہو گا جو بڑی بنیادی اہمیت کی حامل ہے۔ ہر اس شخص کو جو دین کے ضمن میں اپنی ذمہ داریوں کا کچھ بھی احساس و شعور رکھتا ہو اور اپنے ان فرائض کی ادائیگی پر کمربستہ ہو' اس حقیقت کو ذہن نشین کر لینا چاہئے کہ دین کی سربلندی کی جدّوجُہد میں یہ دونوں باتیں بہت اہم ہیں : (i) مقصد کا تعین اور (ii) اس مقصد کے حصول کے لئے صحیح راہ کا تعین۔ دونوں انتہائی ضروری ہیں۔ اگر مقصد کا تعین صحیح نہیں ہی' ہدف غلط معیّن ہو گیا ہے' یا بلا مقصد کسی ایک دائرے (circle) میں حرکت جاری ہے تو لاکھ محنت اور کوشش کے باوجود کوئی نتیجہ نہیں نکلے گا' خواہ ہزاروں اور لاکھوں کی تعداد میں لوگ گھروں سے نکلیں اور چالیس چالیس دن بلکہ اس سے بھی زیادہ

وقت دین کی محنت میں صرف کریں۔ اگر یہ ساری محنت بغیر ہدف کے ہو رہی ہے تو غلبۂ دین کی راہ میں کوئی مؤثر پیش رفت اس ذریعے سے نہیں ہو سکتی۔ منزل اور ہدف کا تعیّن بہت ضروری ہے ـــــ لیکن ہدف کے تعین کے ساتھ ہی اس طے شدہ منزلِ مقصود تک پہنچنے کے صحیح منہج عمل اور طریق کار کا تعین بھی ازحد ضروری ہے۔ اس لئے کہ بسااوقات ایسا ہوتا ہے کہ منزل کے صحیح تعین کے باوجود انسان کسی غلط راستے پر پڑ جاتا ہے۔ صحیح منہج عمل اگر سامنے نہ ہو تو منزل تک پہنچنے کی جلدی میں بعض اوقات انسان کسی راہِ قصیر(short-cut) کو آزمانے کی غلطی کر بیٹھتا ہے' لیکن پھر وہ short-cut کبھی ختم ہونے میں نہیں آتا۔ پھر تمام محنتوں' کوششوں اور قربانیوں کے باوجود منزل دور سے دور تر ہوتی چلی جاتی ہے۔ صحیح منہج عمل کو ترک کرنے کا یہ نتیجہ نکل کر رہتا ہے۔

یہ موٹی سی بات تو ہر شخص کے سمجھ لینے کی ہے کہ ہر مقصد اور ہر ہدف کے حصول کے لئے ہر طریق کار مفید نہیں ہوتا۔ ہر مقصد کے حصول کا اپنا ایک معیّن طریق کار ہوتا ہے۔ اگر کوئی شخص کہیں اشتراکی انقلاب برپا کرنے کا خواہش مند ہے تو اسے ایک خاص منہج عمل اختیار کرنا ہو گا۔ اسے اپنے معاشرے میں طبقاتی شعور پیدا کرنا ہو گا اور اس طبقاتی شعور کو اجاگر کر کے طبقاتی تصادم کو جنم دینا ہو گا۔ لیکن اگر کوئی نیک دل انسان تصادم کو ناپسند کرتا ہو اور اس سے گریز چاہتا ہو تو ظاہر بات ہے کہ وہ اشتراکی انقلاب کی راہ میں آگے نہیں بڑھ سکے گا۔ اس لئے کہ اس انقلاب کا راستہ اسی وادی میں سے ہو کر گزرتا ہے۔

اسی طرح یہ بات جان لیجئے کہ دین کی اقامت اور اس کا غلبہ نبی اکرم ﷺ کی بعثت کے بنیادی مقاصد میں سے ہیں۔ یہ بات پوری وضاحت کی ساتھ سورۃ الصّف کی مرکزی آیت کے حوالے سے ہمارے سامنے آئے گی : ﴿ هُوَ الَّذِیْ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَ دِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ ﴾ اس میں اگر کسی کو اشتباہ ہے' اور نیک نیتی کے ساتھ اشتباہ ہے تو وہ اللہ کے ہاں تو عذر پیش کر سکے گا' لیکن واقعہ یہ ہے کہ پھر قرآن مجید اور اس کے فہم سے اسے کوئی حصّہ حاصل نہیں!

دین کو دنیا میں ایک عملی اور ایک زندہ نظام کی حیثیت سے قائم اور برپا کرنا بعثتِ

محمدی کا بنیادی مقصد ہے۔ اسی کے لئے محنت' اسی کے لئے جِدّوجُہد' اسی کے لئے کوشش' اسی کے لئے جینا' اسی کے لئے مرنا' اسی میں مال اور جان کا کھپانا بندۂ مؤمن کے ایمان کا لازمی تقاضا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بات بھی پیش نظر رہنی چاہئے کہ اس مقصد کی طرف پیش قدمی کا اپنا ایک طریق اور نہج معیّن ہے۔ اگر ہم یہ دیکھیں کہ دنیا میں بعض دوسری تحریکیں کسی اور طریقے پر عمل پیرا ہو کر کامیاب ہو گئیں' کوئی وقتی سا نعرہ کسی تحریک کے لئے مفید ثابت ہو گیا یا کسی نے کوئی short-cut اختیار کیا اور وہ لیلائے اقتدار سے ہمکنار ہو گیا' اور اس قسم کی چیزوں سے متأثر ہو کر ہم بھی ایسا ہی کوئی طریق کار غلبۂ دین کی جِدّوجُہد میں اختیار کریں تو یہ بات ذہن میں رکھئے کہ تمام تر خلوص اور اخلاص کے باوجود کوئی مثبت نتیجہ نہیں نکل سکے گا ـــــ اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ محمدؐ رسول اللہ ﷺ کا اساسی منہج عمل وہ ہے جو سورۃ الجمعہ کی مرکزی آیت میں نہایت دوٹوک الفاظ میں بیان ہوا ہے : ﴿ هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَ یُزَكِّیْهِمْ وَ یُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ ﴾

مقصدِ بعثت کا مضمون تین مرتبہ دہرایا گیا

یہاں یہ عجیب بات بھی نوٹ کرنے کے قابل ہے کہ قرآن مجید میں وہ آیت جس میں حضور ﷺ کے مقصدِ بعثت کا بیان ہے' تین مرتبہ وارد ہوئی ہے۔ دو مرتبہ اس شان کے ساتھ آئی ہے کہ اس میں ایک شوشے کا بھی فرق نہیں ہے : ﴿ هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَ دِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ وَ لَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ۝ ﴾ یہی الفاظ سورۃ التوبہ کی آیت ۳۳ میں وارد ہوئے ہیں اور بعینہٖ انہی الفاظ میں یہ آیت سورۃ الصّف کے وسط میں وارد ہوئی ہے۔ اسی طرح سورۃ الفتح کے آخری رکوع میں آیت ۲۸ کا مرکزی حصّہ بھی انہی الفاظ پر مشتمل ہے' یعنی : ﴿ هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَ دِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ ﴾ ـــــ یہاں تک الفاظ بالکل وہی ہیں جو سورۃ التوبہ اور سورۃ الصّف میں وارد ہوئے ہیں' البتہ آیت کے آخری حصے میں یہاں ﴿ وَ لَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ﴾ کی بجائے ﴿ وَ كَفٰی بِاللّٰهِ شَهِیْدًا ﴾ کے الفاظ لائے گئے ہیں۔

اساسی منہج عمل کا ذکر چار مقامات پر!

اب آیئے سورۃ الجمعہ کی مرکزی آیت کی طرف جو حضور نبی اکرم ﷺ کے بنیادی طریق کار یا بالفاظِ دیگر انقلابِ محمدیؐ کے اساسی منہاج کو معیّن کر رہی ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ سورۃ الصّف کی مرکزی آیت قرآن حکیم میں تین مرتبہ وارد ہوئی تھی تو یہ آیت ترتیب کے ذرا سے فرق کے ساتھ قرآن مجید میں چار مرتبہ آئی ہے۔ اولاً یہ آیت سورۃ البقرۃ کے پندرہویں رکوع میں وارد ہوئی ہے جہاں نقشہ کھینچا گیا ہے حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام کا جبکہ وہ خانہ کعبہ کی بنیادیں اٹھا رہے تھے : ﴿ وَاِذْ يَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَاِسْمٰعِيْلُ ﴾

اُس وقت جو دعائیں ان کی زبانوں پر تھیں ان میں ایک دعا تو یہ تھی کہ اے پروردگار! ہمیں اپنا فرمانبردار بنائے رکھ اور ہماری ذریت اور اولاد میں سے ایک اُمّتِ مُسلمہ برپا کیجیو! اور پھر ان کی آخری اور نہایت اہم دعا یہ نقل ہوئی کہ :

﴿ رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ ؕ ﴾ (البقرۃ : ۱۲۹)

"اے پروردگار! ان میں اپنا ایک رسول مبعوث کیجیو جو انہیں تیری آیات پڑھ کر سنائے، انہیں کتاب اور حکمت کی تعلیم دے اور ان کا تزکیہ کرے!"

یہ ہے درحقیقت بعثتِ محمدی علیٰ صاحبہا الصّلوٰۃ والسّلام کے لئے ابراہیم اور اسماعیل علیہما السلام کی دعاء۔ پھر تین رکوعوں کے بعد سورۃ البقرۃ ہی میں اٹھارہویں رکوع کے اختتام پر اعلان ہوتا ہے :

﴿ كَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْكُمْ رَسُوْلًا مِّنْكُمْ يَتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِنَا وَيُزَكِّيْكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ.... ﴾ (البقرۃ : ۱۵۱)

"جیسا کہ ہم نے بھیج دیا ہے تمہارے اندر اپنا ایک رسول جو تمہیں ہماری آیات پڑھ کر سناتا ہے، تمہارا تزکیہ کرتا ہے اور تمہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے . . . "

اعلان کر دیا گیا کہ محمد ﷺ کی بعثت دراصل اُسی دعاءِ ابراہیم و اسمٰعیل علیہما السلام کا ظہور ہے۔

سورۃ آل عمران میں اس مضمون کی پھر تکرار ہوئی ہے :

﴿ لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۚ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝ ﴾ (آل عمران : ۱۶۴)

"اللہ کا احسان ہے اہل ایمان پر کہ اس نے ان میں اپنا ایک رسول مبعوث کیا انہی میں کا' جو انہیں اس کی آیات پڑھ کر سناتا ہے' ان کا تزکیہ کرتا ہے اور انہیں کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔"

ان تین مقامات کے بعد اب چوتھی بار یہی مضمون یہاں سورۃ الجمعہ کی دوسری آیت میں' جو اس سورۂ مبارکہ کی مرکزی آیت ہے' وارد ہوا ہے۔ اور اس طرح ان دونوں سورتوں کے باہم مجتمع ہونے سے وہ حسین و جمیل جوڑا وجود میں آیا جو ایک طرف بعثتِ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے مقصد کو معین کر رہا ہے اور دوسری طرف اس مقصد کے حصول کے لئے صحیح منہج عمل اور بنیادی طریق کار کو معیّن کر رہا ہے۔

اب ہم ان سورتوں کے مطالعے کا آغاز کریں گے اور اس کے لئے ہمیں اپنے سابقہ معمول سے قدرے مختلف طریق کار اختیار کرنا ہو گا۔ اس لئے کہ ان سورتوں کا درس اگر اس نہج پر ہو کہ پہلے ایک ایک آیت پر توجہات کو مرتکز کیا جائے اور پھر ان میں شامل ایک ایک لفظ کی گہرائی میں اترنے کی کوشش کی جائے تو اندیشہ ہے کہ یہ معاملہ بہت طول اختیار کر جائے گا۔ ان دونوں سورتوں کے درس میں یہ طریق ملحوظ رہے گا کہ اوّلاً ہر سورۃ کی مرکزی آیت کو خوب اچھی طرح سمجھ لیا جائے تاکہ وہ اصل سرا یا ڈور ہاتھ میں آ جائے جس میں یہ موتی پروئے ہوئے ہیں۔ اس مرکزی آیت کو سمجھنے کے بعد پھر مختلف آیات کے ساتھ اس مرکزی مضمون کے ربط و تعلق کو سمجھنے کی کوشش کی جائے' تاکہ بحیثیتِ مجموعی سورۃ کا اصل مفہوم واضح ہو جائے۔ اسی طریقے سے سورۃ الصّف کا مطالعہ ہو گا اور اسی نہج پر ان شاء اللہ العزیز سورۃ الجمعہ کا مطالعہ ہو گا۔

نبی اکرم ﷺ کے مقصدِ بعثت کی دو شانیں

اس سے پہلے کہ ہم سورۃ الصّف کی مرکزی آیت پر غور شروع کریں' ایک بنیادی

حقیقت کی طرف توجّہ کرلینا مفید ہو گا۔ ہماری اس گفتگو میں بار بار نبی اکرم ﷺ کے مقصدِ بعثت کا حوالہ آیا ہے۔ تو یہ جان لینا چاہئے کہ نبی اکرم ﷺ کے مقصدِ بعثت کی دو شانیں ہیں۔ اس لئے کہ اگرچہ آپؐ بھی یقیناً دوسرے انبیاء کی طرح اللہ کے ایک نبی ہیں لیکن آپؐ صرف نبی نہیں بلکہ خاتم النبیین بنا کر بھیجے گئے ہیں۔ اسی طرح اگرچہ آپؐ کو بھی دیگر رسولوں کی طرح رسالت سے سرفراز کیا گیا ہے لیکن آپؐ صرف ایک رسول نہیں، آخر المرسلین بھی ہیں۔ گویا آپؐ کی بعثت کے مقاصد میں وہ تمام چیزیں بھی شامل ہیں جو تمام نبیوں اور رسولوں کے پیش نظر تھیں، اور اضافی طور پر آپؐ کے مقصد بعثت کی ایک خصوصی اور امتیازی شان ختمِ نبوت اور ختمِ رسالت کے حوالے سے ہے جس میں آپؐ تمام انبیاء و رسل میں ممتاز ہیں۔

ختمِ نبوت اور ختمِ رسالت کے ایک پہلو سے تو ہم سب خوب اچھی طرح واقف ہیں، یعنی یہ کہ حضور ﷺ کے بعد اب کوئی نبی نہیں آئے گا، نہ کوئی صاحبِ شریعت نبی اور نہ کوئی بغیر شریعت نبی، نہ کوئی ظلّی نبی اور نہ ہی کوئی بروزی نبی! آپؐ پر ہر نوع کی نبوت و رسالت ختم ہو گئی، لیکن ختم نبوت و رسالت کا دوسرا اور اہم تر پہلو یہ ہے کہ آپؐ پر نبوّت و رسالت کا محض اختتام ہی نہیں ہوا، اتمام بھی ہوا ہے، تکمیل بھی ہوئی ہے۔ نبی اکرم ﷺ کی بعثت کا یہ وہ امتیازی پہلو ہے جو بالعموم ہماری نگاہوں سے اوجھل رہتا ہے۔ حاصلِ کلام یہ کہ آپؐ کا بنیادی مقصدِ بعثت یقیناً وہی ہے جو تمام انبیاء اور تمام رسولوں کا تھا، لیکن آپؐ کے مقصدِ بعثت میں ایک تکمیلی اور اتمامی شان بھی ہے جس کی حیثیت ختمِ نبوت اور تکمیلِ رسالت کے عکس اور پرتو کی ہے اور اس میں کوئی دوسرا نبی اور رسولؑ آپؐ کے ساتھ شریک نہیں! سورۃ الصّف میں درحقیقت حضور ﷺ کے مقصدِ بعثت کے اسی پہلو کی طرف اشارہ ہے، اور اسی کے حوالے سے جہاد و قتال کا موضوع وہاں تفصیل سے زیر بحث آیا ہے۔

جہاں تک آپ ﷺ کے اس بنیادی مقصدِ بعثت کا تعلق ہے جو تمام انبیاء اور رسولوں کا مشترکہ مقصدِ بعثت رہا ہے، اس کے بارے میں یہاں کسی تفصیلی بحث کی ضرورت نہیں ہے۔ اس حوالے سے جو فرائضِ نبوّت دیگر انبیائے کرام علیہم السلام ادا کرتے

رہے وہی فرائض آپ ﷺ کو بھی تفویض ہوئے۔ قرآن حکیم میں کئی مقامات پر اس حقیقت کو بیان کیا گیا کہ :

﴿ وَمَا نُرْسِلُ الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّا مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ ﴾ (الکہف : ۵۶)

"ہم رسولوں کو نہیں بھیجتے مگر مبشّر اور نذیر بنا کر۔"

بعثتِ انبیاء و رُسل کے ضمن میں یہ اللہ کا ایک عمومی قاعدہ ہے۔ چنانچہ یہی بات حضور ﷺ کے بارے میں بھی قرآن میں وارد ہوئی ہے :

﴿ وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا مُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا ۝ ﴾ (بنی اسراء یل : ۱۰۵)

"اور (اے نبی) ہم نے نہیں بھیجا آپؐ کو مگر بشیر اور نذیر بنا کر۔"

اسی طرح ہر نبی اپنی جگہ ہدایت و رہنمائی کا ایک روشن چراغ ہے' ہر نبی معلّم ہے' ہر نبی مربّی اور مزکّی ہے' ہر نبی داعی ہے' مبلّغ ہے اور مذکّر ہے۔ یہ ساری حیثیتیں جملہ انبیاءِ کرام میں مشترک ہیں۔ چنانچہ محمدؐ رسول اللہ ﷺ میں بھی یہ تمام حیثیتیں جمع ہیں۔ اگرچہ ان میں سے ہر حیثیت کے اعتبار سے بھی نبی اکرم ﷺ ایک امتیازی شان کے حامل ہیں ع "ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است!" تاہم یہ وہ مشترک اوصاف اور حیثیتیں ہیں جو تمام انبیاء و رُسل کو حاصل تھیں۔ سورۃ الاحزاب کی یہ مشہور آیت سب کو یاد ہے :

﴿ يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا ۝ وَّدَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا ۝ ﴾ (الاحزاب : ۴۵'۴۶)

"اے نبی! ہم نے آپؐ کو بھیجا ہے شاہد (گواہ) بنا کر' مبشّر بنا کر اور مُنذر بنا کر (یعنی سیدھی راہ اختیار کرنے والوں کے لئے بشارت دینے والا بنا کر اور فکری و عملی کج روی اختیار کرنے والوں کے لئے خبردار کرنے والا بنا کر) اور اللہ کی طرف بلانے والا اس کے حکم سے اور ہدایت کا ایک روشن چراغ بنا کر۔"

یہ تمام حیثیتیں مشترک ہیں نبی اکرم ﷺ میں اور جملہ انبیاء و رُسل میں۔ جہاں تک اس بنیادی مقصدِ بعثت کا تعلق ہے اس کے ضمن میں قرآن حکیم کی سب سے جامع اصطلاح "شہادت علی النّاس" کی ہے۔ ہمارے اس منتخب نصاب میں سورۃ الحج کی آخری آیت کے درس میں "شہادت علی النّاس" کا موضوع تفصیل سے زیر بحث آیا تھا۔ اور وہیں یہ توجّہ

بھی دلائی گئی تھی کہ یہ مضمون ایک عکسی ترتیب کے ساتھ سورۃ البقرۃ میں بھی جوں کا توں موجود ہے : ﴿ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ﴾

اس آیۂ مبارکہ کے حوالے سے یہ بات بڑی وضاحت سے ہمارے سامنے آئی تھی کہ ختمِ نبوت و رسالت کے بعد "شہادت علی النّاس" کی ذمّہ داری اب اُمّتِ مُسلمہ کے کاندھے پر آ چکی ہے۔ اس کے لئے سعی و جُہد' اس کے لئے ایثار و قربانی' اس کے لئے اوقات اور صلاحیتیں کھپانا اور مال و جان کا لگانا' درحقیقت جہاد فی سبیل اللہ کی غایتِ اولیٰ ہے۔ یہ مقصدِ اوّلین ہے جہاد فی سبیل اللہ کا! ـــــ اور جہاں تک تعلق ہے محمدؐ رسول اللہ ﷺ کے مقصدِ بعثت کی امتیازی اور تکمیلی شان کا' اس کے اعتبار سے بھی ایک فرضِ منصبی اب تا قیامِ قیامت اُمّتِ مُسلمہ کے کاندھے پر ہے۔ محمدؐ رسول اللہ ﷺ کے مشن کی تکمیل اب ایک ذمہ داری کے طور پر منتقل ہو چکی ہے آپؐ کے ماننے والوں پر' جو اپنے آپ کو نبی اکرم ﷺ کی شفاعت کا حق دار سمجھتے اور آپؐ سے اپنی نسبت پر فخر کرتے ہیں۔ یقیناً آپؐ کی اُمّت میں سے ہونا مسلمانوں کے لئے موجبِ صد افتخار ہے' لیکن جہاں یہ بہت بڑی فضیلت کی بات ہے وہاں اتنی ہی بڑی ذمے داری کا معاملہ بھی اس سے وابستہ ہے ؏

"جن کے رتبے ہیں سوا ان کی سوا مشکل ہے!"

اس پہلو سے سورۃ الصّف کی بڑی اہمیت ہے کہ یہ سمجھا جائے کہ نبی اکرم ﷺ کے مقصدِ بعثت کی امتیازی شان کیا ہے اور اس کے ضمن میں کیا عملی ذمہ داریاں ہیں جو آپؐ کے ماننے والوں پر' آپؐ کی اُمّت پر عائد ہوتی ہیں!

نبیِّ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مقصدِ بعثت کی تعیین

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَکَفٰی وَصَلٰوۃٌ عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی ۔۔۔ اَمَّا بَعْدُ :

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ۔۔۔ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

﴿ هُوَ الَّذِیْ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ۝ ﴾ (الصف : ۹) ۔۔۔ صَدَقَ اللّٰہُ الْعَظِیْمُ

سورۃ الصف کی یہ آیت' جیسا کہ اس سے قبل عرض کیا جا چکا ہے' باعتبارِ مضمون اس سورۂ مبارکہ کی مرکزی آیت ہے۔ اسی سے اس سورۃ کا عمود معیّن ہوتا ہے۔ یہ بات بھی عرض کی جا چکی ہے کہ اس آیۂ مبارکہ کا بڑا اور مرکزی حصّہ جوں کا توں قرآن مجید میں تین مقامات پر وارد ہوا ہے۔ اس تکرار اور اعادے سے دراصل اس مضمون کی اہمیت کی جانب رہنمائی ہوتی ہے۔ یقیناً قرآن مجید میں بعض الفاظ یا مضامین کا بار بار آنا اُن کی اہمیت پر دلالت کرتا ہے۔ اس آیۂ مبارکہ کو امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمہ اللہ نے اپنی شہرۂ آفاق تصنیف "اِزَالَۃُ الْخِفَا عَنْ خِلَافَۃِ الْخُلَفَاءِ" میں قرآن کریم کی اہم ترین آیات میں سے شمار کیا ہے۔ بلاشبہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مقصدِ بعثت کے تعیّن میں اس آیۂ مبارکہ کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ مولانا عبید اللہ سندھی نے اسے "اسلامی انقلاب" کے لئے عنوان قرار دیا تھا۔ بعض حضرات نے یہ بات نقل کی ہے' اگرچہ میں خود اس کی تصدیق نہیں کر پایا' کہ حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمہ اللہ نے اس آیۂ مبارکہ کو پورے قرآن مجید کے لئے بمنزلۂ عمود قرار دیا ہے۔ اور اس میں تو ہرگز شک نہیں کہ سیرتِ محمدی ؐ کو سمجھنے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کارنامۂ حیات کا صحیح صحیح اندازہ کرنے کے لئے کہ آپؐ کی عملی جدّوجُہد کن کن مراحل میں سے ہو کر گزری' کہاں سے سفر شروع ہوا اور کہاں پر ختم ہوا' اس آیت کا سمجھنا ناگزیر ہے۔ اس لئے کہ واقعہ یہ ہے کہ سیرتِ نبوی ؐ کو سمجھنے میں لوگوں نے بڑی ٹھوکریں کھائی ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اگر صرف دوسرے انبیاء پر قیاس کیا جائے تو بہت سی چیزیں سمجھ میں نہیں آتیں۔

مستشرقین کی کوتاہ فہمی

مستشرقین نے بالخصوص اس معاملے میں بڑا دھوکہ کھایا ہے۔ ان کے سامنے نبوّت و رسالت کے آئیڈیل حضرت مسیح یا حضرت یحییٰ علیہما السلام ہیں اور ان کی زندگی میں کسی قتال یا جنگ کا سراغ نہیں ملتا۔ چنانچہ مغربی مفکرین اور مستشرقین کو جنگ و قتال کا معاملہ منصبِ رسالت سے بڑا ہی متصادم نظر آتا ہے۔ وہ ان دونوں کو ایک دوسرے کی ضد سمجھتے ہیں۔ چنانچہ مشہور مؤرخ ٹائن بی کا یہ جملہ بہت مشہور ہے :

"*Muhammad failed as a prophet but succeeded as a statesman*"

ان کے نزدیک حضور ﷺ کی زندگی کا جو نقشہ مکّی دَور میں سامنے آتا ہے صرف وہی نبوّت و رسالت سے مطابقت رکھتا ہے' جبکہ وہاں سے آپؐ کو ہجرت کرنا پڑی۔ گویا ان کے خیال میں بحیثیتِ نبی اور رسول آپ ﷺ ناکام ہو گئے۔ (معاذ اللہ)۔ اس کے برعکس مدنی دَور کا جو نقشہ ان کے سامنے آتا ہے اس میں انہیں آنحضور ﷺ ایک حکمران' ایک مدبّر' ایک سیاست دان اور ایک سپہ سالار کی حیثیت میں نظر آتے ہیں۔ اور اس پہلو سے وہ دیکھتے ہیں کہ آپؐ کامیابی کی انتہاؤں کو چھو رہے ہیں۔ اور واقعہ یہ ہے کہ کون اندھا ہو گا کہ جس کی نگاہیں آپؐ کی عظمت کے احساس سے جھک نہ جائیں کہ کامیابی گویا اپنے آخری اور تکمیلی درجے میں محمد ﷺ کے قدم چومتی نظر آتی ہے۔ لیکن یہاں مغربی مؤرخین اور مستشرقین نے یہ گرہ لگا دی کہ یہ کامیابی بحیثیت "statesman" تھی' بحیثیتِ نبی نہیں تھی۔ اسی مغالطے کو پیدا کرنے کے لئے سر منٹگمری نے سیرتِ نبویؐ پر جو کتاب لکھی اسے دو حصّوں میں تقسیم کیا : "Mohammad at Mecca" اور "Mohammad at Madina" اور اس طرح اس نے مکّی اور مدنی دور کے ظاہری تضاد کو نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے۔ اگرچہ حضور ﷺ کی تعریف میں اس نے کہیں بخل سے کام نہیں لیا' بلکہ اس نے نبی اکرم ﷺ کو نسلِ آدم کے عظیم ترین افراد میں شمار کیا ہے۔ آپؐ کے تدبّر' آپؐ کی فراست' آپؐ کی معاملہ فہمی' آپؐ کی پیش بینی' آپؐ کی دور اندیشی' ان تمام اعتبارات سے اس نے آپؐ کی صلاحیتوں کا لوہا مانا ہے اور

آپؐ کی تعریف میں آخری حد تک چلا گیا ہے۔ لیکن ہم لوگ بھول جاتے ہیں کہ اس مٹھاس کے اندر اس نے بڑے لطیف پیرائے میں ایک زہر بھی شامل کر دیا ہے۔ وہ زہر یہی ہے کہ وہ لوگ یہ تصور دینا چاہتے ہیں کہ آپؐ کی یہ تمام کامیابیاں ایک سیاست دان اور ایک مدبّر کی حیثیت سے تھیں، نبی کی حیثیت سے نہیں تھیں۔ یہ سارا مغالطہ اسی بنیاد پر ہے کہ ختمِ نبوت اور تکمیلِ رسالت کے لازمی اور منطقی تقاضے کو نہیں سمجھا گیا۔ اس اعتبار سے حقیقت یہ ہے کہ سیرتِ محمدیؐ کے صحیح فہم کے لئے یہ آیۂ کریمہ انتہائی اہمیت کی حامل ہے۔

رسولِ کامل ﷺ

اس تمہید کے بعد اب ذرا اس آیۂ مبارکہ کے ایک ایک لفظ پر غور کیجئے۔ ﴿ هُوَ الَّذِیْ ﴾ "وہی ہے وہ"۔ یہاں اشارہ ہے ذاتِ باری تعالیٰ کی طرف۔ اس لئے کہ سورۃ الصف میں جو آیت اس آیت سے متّصلاً قبل وارد ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ ﴿ یُرِیْدُوْنَ لِیُطْفِـُٔوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ وَاللّٰهُ مُتِمُّ نُوْرِهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ ۝ ﴾ "یہ چاہتے ہیں کہ اللہ کے نور کو اپنی پھونکوں سے بجھا دیں، مگر اللہ اپنے نور کا اتمام فرما کر رہے گا، خواہ یہ کافروں کو کتنا ہی ناگوار ہو"۔ اس پہلو سے جب "هُوَ" سے اگلی آیت شروع ہوئی تو معین ہو گیا کہ اس سے مراد ہے ذاتِ باری تعالیٰ۔

آگے چلئے ﴿ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ ﴾ "(وہی ہے اللہ) جس نے بھیجا اپنے رسول (ﷺ) کو"۔ ظاہر بات ہے کہ یہ ذکر ہے محمد ﷺ کا۔ عربی زبان میں اَرْسَلَ، یُرْسِلُ، اِرْسَالاً کا مفہوم ہے بھیجنا۔ کسی کو ایلچی بنا کر، سفیر بنا کر یا پیغامبر بنا کر بھیجنا۔ یہاں آنحضور ﷺ کے حوالے سے یہ بات سمجھ لینی چاہئے کہ مختلف انبیاء و رُسل (علیہم السلام) کے اسماء کے ساتھ ان کی بعض خصوصی نسبتوں کا ذکر ملتا ہے۔ مثلاً حضرت آدمؑ کے ساتھ صفیّ اللہ کے الفاظ معروف ہیں۔ اسی طرح حضرت نوحؑ کو نجیّ اللہ، حضرت ابراہیمؑ کو خلیل اللہ، حضرت اسماعیلؑ کو ذبیح اللہ، حضرت موسیٰؑ کو کلیم اللہ اور حضرت عیسیٰؑ کو روح اللہ کے الفاظ سے یاد کیا جاتا ہے۔ لیکن اس فہرست میں حضرت محمد ﷺ کے نام کے ساتھ "رسول اللہ" ہی

کے الفاظ معروف و مشہور ہیں۔ غور کرنے پر یہ حقیقت کھلے گی کہ اگرچہ نوحؑ بھی اللہ کے رسول تھے، موسیٰؑ بھی رسول تھے، عیسیٰؑ بھی اللہ کے رسول تھے، لیکن اس لفظ "رسول" کا مصداقِ کامل اور مصداقِ اَتم ہیں محمدؐ رسول اللہ ﷺ۔ رسالت کا ادارہ تکمیل کو پہنچا ہے محمدؐ رسول اللہ ﷺ کی ذاتِ مبارکہ میں۔ گویا آپؐ کا امتیازی لقب یا امتیازی شان ہی یہ ہے کہ آپؐ "رسول اللہ" ہیں۔ سورۃ الفتح میں آپؐ کی اسی نسبت کو نمایاں کیا گیا ہے : ﴿ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ ﴾ اس میں گویا اس حقیقت کی جانب ایک لطیف اشارہ موجود ہے جس کی جانب پہلے توجہ دلائی جا چکی ہے کہ رسالت اپنے مرتبۂ کمال کو پہنچ گئی محمدؐ رسول اللہ ﷺ کی ذات میں!

"الْهُدٰى" اور "دِيْنِ الْحَقِّ"

اب آگے بڑھئے : ﴿ هُوَ الَّذِيْۤ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ ﴾ حرفِ "ب" عربی میں کسی چیز کی معیت کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ مفہوم یہ ہوا کہ اللہ نے اپنے رسول محمد ﷺ کو دو چیزیں دے کر بھیجا ہے : (۱) الھدیٰ اور (۲) دین الحق۔ الھدیٰ سے مُراد ہے ہدایتِ کاملہ، وہ کتابِ ہدایت کہ جس نے ہدایت کے تمام پہلوؤں کو اپنے اندر جمع کر لیا ہو، سمیٹ لیا ہو، سمو لیا ہو۔ اس کی تعیین کے ضمن میں اگر قرآن مجید ہی کی طرف رجوع کیا جائے تو صاف نظر آ جائے گا کہ اس سے مراد خود قرآن ہے۔ اس لئے کہ اسی قرآن کے لئے سورۃ البقرۃ کے بالکل آغاز میں "هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ" کے الفاظ آئے ہیں۔ اسی کو "هُدًى لِّلنَّاسِ" قرار دیا گیا ہے۔ اور یہی قرآن ہے جس کے بارے میں سورۃ بنی اسرائیل میں ارشاد ہوا : ﴿ اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَهْدِيْ لِلَّتِيْ هِيَ اَقْوَمُ ﴾ تو معلوم ہوا کہ الھدیٰ سے مراد ہے قرآن حکیم!

اب آگے بڑھیے! دوسری چیز جو آپ ﷺ کو دے کر بھیجا گیا وہ دینِ حق ہے۔ یہاں "دین الحق" عربی نحو کے اعتبار سے مرکب اضافی کی شکل میں ہے۔ اسی اعتبار سے اس کے معنی ہوں گے "حق کا دین"۔ تاہم عربی میں بعض اوقات مرکب توصیفی، مرکب اضافی کی شکل میں آ جاتا ہے۔ اس صورت میں اس کا ترجمہ ہوگا : حق دین یا سچا دین۔ ویسے

ان دونوں صورتوں میں مفہوم میں کوئی فرق واقع نہیں ہوتا' اس لئے کہ اسے اگر حق کا دین قرار دیں تو قرآن مجید میں ایک سے زائد مقامات پر اللہ کو "الحق" کہا گیا ہے۔ ﴿ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ﴾ مجسّم حق اور کامل حق صرف ذاتِ باری تعالیٰ ہے۔ گویا "حق کا دین" کے معنی ہوں گے اللہ کا دین۔ اور اگر اسے مرکبِ توصیفی مان کر "سچا دین" ترجمہ کیا جائے تو بھی بات وہیں جا پہنچے گی' اس لئے کہ سچا ترین دین تو اللہ ہی کا ہو سکتا ہے۔

لیکن سوال یہ ہے کہ اللہ کے دین سے کیا مراد ہے؟ لفظ دین پر غور کیجئے! یہ لفظ اس سے پہلے ہمارے اسباق میں سورۃ الفاتحہ کے درس میں "مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ" کے ضمن میں زیر بحث آچکا ہے۔ اُس وقت عرض کیا گیا تھا کہ اس لفظ کا بنیادی مفہوم ہے جزا و سزا اور بدلہ۔ مشہور مصرع ہے ع دِنّاهُمْ كَمَا دَانُوْا۔ کہ جیسا انہوں نے ہمارے ساتھ معاملہ کیا تھا ویسا ہی ہم نے ان سے کر دیا۔ یعنی ہم نے ان کے عمل کا انھیں پورا پورا بدلہ دے دیا ہے۔ اسی طرح ایک معروف کہاوت ہے: "كَمَا تَدِيْنُ تُدَانُ" جیسا کروگے ویسا بھروگے۔ عربی زبان میں "دَيْنٌ" کہتے ہیں قرض کو' کہ وہ لوٹ کر آتا ہے۔ جس طرح کسی عمل کی جزا عمل کرنے والے کی طرف لوٹ کر آتی ہے اسی طرح "دین" (قرض) دینے والے کو واپس ملتا ہے۔ تو دین کے اصل لغوی معنی بدلے اور جزا و سزا کے ہیں۔ لیکن قرآن مجید نے جب اس لفظ کو اس اصل لغوی اساس سے اٹھا کر اسے اپنی ایک اصطلاح بنایا تو اس میں ایک اضافی مفہوم شامل ہو گیا۔ چنانچہ قرآنی اصطلاح میں لفظ دین بالعموم قانون' ضابطہ اور شریعت کے معنوں میں آتا ہے' اس لئے کہ جزا و سزا کے ساتھ کسی نہ کسی قانون اور ضابطے کا تصور لازم و ملزوم ہے۔ پھر اس میں اضافی مفہوم پیدا ہوا اطاعت کا۔ قرآن حکیم میں متعدد بار "مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ" کے الفاظ آئے ہیں۔ یعنی "اطاعت کو اس (اللہ ہی) کے لئے خالص کرتے ہوئے"۔ اس لئے کہ کسی قانون یا ضابطے کی اگر اطاعت کی جائے گی تو جزا ملے گی' اور اگر اس کی خلاف ورزی ہوئی تو سزا ملے گی۔ اس سے بھی آگے بڑھ کر قرآن مجید نے جب اسے دِيْنُ اللّٰهِ (النصر: ۱) کی مرکب

شکل میں ایک گھمبیر اصطلاح کا درجہ دیا تو اس میں جو مفہوم پیدا ہوا اسے اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے! کسی ہستی کو مطاعِ مطلق مان کر اس کے قانون کے تحت جو زندگی بسر کی جائے گی وہ زندگی گویا اس کے دین کے اندر رہتے ہوئے گزاری جا رہی ہے۔ یہ ہے دین کا گھمبیر، ہمہ گیر اور جامع تصور جسے قرآن مجید نے ایک بہت اہم اصطلاح کی حیثیت سے متعارف کرایا ہے۔

چنانچہ اس تناظر میں غور کیجئے کہ اگر کسی جگہ بادشاہت کا نظام قائم ہے، ایک فردِ واحد کو ہی حاکم مطلق (soverign) ہونے کی حیثیت حاصل ہے، اس کی زبان سے نکلا ہوا ہر لفظ قانون کا درجہ رکھتا ہے تو یہ گویا کہ "دینُ المَلِک" ہے۔ اس لئے کہ اس نظام میں بادشاہ مطاعِ مطلق ہے۔ یہ لفظ بعینہٖ اسی مفہوم میں سورۃ یوسف میں وارد ہوا ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام کی زندگی کے ایک خاص واقعے کے ضمن میں "دینُ المَلِک" کے الفاظ آئے ہیں۔ یہ واقعہ لمبا ہے، مختصراً یہ کہ حضرت یوسف علیہ السلام جب مصر میں ایک بہت بڑے عہدے پر فائز ہو چکے تھے اور ان کے بھائی قحط کے ہاتھوں مجبور ہو کر اُن کے پاس غلہ حاصل کرنے کے لئے آئے، تو انہوں نے اپنے حقیقی بھائی بن یامین کو، جسے انہوں نے خاص طور پر فرمائش کر کے بلوایا تھا، اپنے پاس روکنا چاہا، لیکن چونکہ انہوں نے خود کو اپنے بھائیوں پر ظاہر نہیں کیا تھا، بلکہ بھائی اس حقیقت سے بالکل بے خبر تھے کہ ان کا واسطہ جس "عزیزِ مصر" سے ہے وہ ان کا بھائی یوسف ہے، لہٰذا بن یامین کو اپنے پاس روکنے کا کوئی معقول سبب بظاہر بھائی نہیں دیتا تھا۔ تب اللہ تعالیٰ نے انہیں ایک خاص طریقہ سجھایا اور ایک خصوصی تدبیر کے ذریعے وہ اپنے بھائی کو روکنے میں کامیاب ہو گئے۔ سورۃ یوسف میں اس پورے واقعہ کو بیان کرنے کے بعد فرمایا گیا ﴿ مَا كَانَ لِيَأْخُذَ أَخَاهُ فِي دِينِ الْمَلِكِ ﴾ کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے لئے اس بادشاہی نظام کے اندر رہتے ہوئے (جس میں وہ خود ایک اہم عہدہ پر فائز تھے) یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ اپنے بھائی بن یامین کو روک سکتے! تو یہ بات واضح ہو گئی کہ کسی فردِ واحد کو مختارِ مطلق اور مطاعِ مطلق مان کر اس کے تحت جو اجتماعی نظام کسی جگہ پر قائم ہو گا اسے دینُ المَلِک کہا جائے گا۔ اسی پر قیاس کرتے ہوئے آپ دورِ جدید کے مقبول ترین نظام یعنی جمہوریت کو، "دین

الجمہور" سے تعبیر کرسکتے ہیں۔ اس لئے کہ اس نظام میں اصل حاکمیت جمہور کی ہے۔ ان کے نمائندے کثرتِ رائے سے جس چیز کو چاہیں جائز قرار دے دیں اور جس چیز کو چاہیں ناجائز قرار دے دیں۔ یہ ایک مکمل نظام ہے' پورا دین ہے' جسے بجا طور پر دین جمہور قرار دیا جاسکتا ہے۔

اس پس منظر پر غور کیجئے کہ "دین اللہ" اور "دین حق" کا مفہوم کیا ہوگا! وہ نظام جس میں اللہ ہی کو مطاع مطلق تسلیم کیا جائے' حاکمیتِ مطلقہ (Sovereignty) صرف اسی کے لئے ہوگی

سروری زیبا فقط اُس ذاتِ بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اک وہی' باقی بتانِ آزری!

اس اصول پر مبنی پورے نظامِ زندگی کا جو مکمل ڈھانچہ استوار ہوگا وہ کہلائے گا "دین اللہ"۔ یہ "دین اللہ" یا "دین حق" ہے جو حضور نبی اکرم ﷺ کو دے کر مبعوث فرمایا گیا تھا۔ یہ وہ دوسری چیز ہے جو آپؐ کو عطا ہوئی تھی۔ ذہن نشین کرلیجئے! پہلی چیز جو آپؐ کو عطا ہوئی وہ ہے "الہدیٰ" یعنی قرآن حکیم اور دوسری شے جو دے کر آپؐ مبعوث فرمائے گئے اسے قرآن نے "دِین الحق" سے تعبیر فرمایا ہے۔ یعنی عدل و قسط پر مبنی ایک مکمل نظامِ اجتماعی' ایک مکمل ضابطۂ حیات' ایک کامل نظامِ اطاعت جس میں زندگی کے ہر گوشے کے بارے میں ضابطہ و قانون موجود ہے۔

یہاں ذہن میں ایک سوال یہ آسکتا ہے کہ کیا قرآن میں کامل نظام نہیں ہے؟ "الہدیٰ" کے بعد حرف "و" واوِ عطف ہے اور واوِ عطف مغائرت کا متقاضی ہے۔ پھر "دین الحق" قرآن سے کوئی جدا شے ہے؟ تو واقعہ یہی ہے کہ صرف قرآن پر مبنی کوئی نظام نہیں ہو سکتا۔ قرآن میں صرف اصول دیئے گئے ہیں اور زندگی کے ہر گوشے کے متعلق صرف حدود کو معین کردیا گیا ہے۔ ایک مکمل نظام اگر بنتا ہے تو وہ قرآن پر سُنّتِ رسولؐ کے اضافے سے بنتا ہے۔ اس خاکے کے اندر اگر رنگ بھرا جاسکتا ہے تو وہ سُنّتِ رسولؐ کے اضافے سے بھرا جاسکتا ہے۔ ایک مکمل نظام کی تشکیل کتاب اور سُنّت دونوں کے مجموعے سے ہوگی۔ یہ بات اس سے پہلے بھی عرض کی گئی ہے کہ ہمارے ہاں پاکستان کی جو بھی کبھی کوئی دستوری دستاویز بنی ہے تو اس میں یہ الفاظ صحیح طور پر شامل ہوئے ہیں :

"NO LEGISLATION WILL BE DONE REPUGNANT TO THE QURAN AND THE SUNNAH"

اس لئے کہ قرآن و سنت کے اجتماع ہی سے دین حق مکمل ہوتا ہے اور ایک پورا نظام تشکیل پاتا ہے۔

نبی اکرم ﷺ کی بعثت کے لئے وقت کی تعیین!

اب آگے بڑھنے سے پہلے ایک اہم علمی حقیقت کی طرف توجہ مبذول فرمالیں۔ اللہ تعالیٰ کا کوئی فعل حکمت سے خالی نہیں۔ اب ذرا ذہن کے سامنے ایک سوالیہ نشان لائیے کہ آنحضور ﷺ کی بعثت کا وقت معین کرنے میں اللہ کی کون سی حکمت تھی؟ اس کی تفتیش کیجئے تو عجیب حقائق سامنے آتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ اس کرۂ ارضی پر نسل انسانی کی تاریخ اور تاریخ نبوت دونوں ساتھ ساتھ چلی ہیں۔ حضرت آدم علیہ السلام پہلے انسان ہی نہیں پہلے نبی بھی تھے۔ انسانیت اور نبوت کے یہ قافلے ساتھ ساتھ چلے ہیں اور دونوں قافلوں نے ارتقائی مراحل طے کیے ہیں۔ انسان نے بھی ارتقائی مراحل طے کئے ہیں اور نبوت و رسالت میں بھی ایک ارتقاء کا عمل جاری رہا ہے۔ اور یوں کہا جاسکتا ہے کہ انسان نے آج سے چودہ سو برس پہلے دو اعتبارات سے عہدِ طفولیت سے قدم نکال کر اپنی جوانی میں قدم رکھا ہے۔ قرآن مجید میں الفاظ آتے ہیں : "حَتّٰی اِذَا بَلَغَ اَشُدَّهٗ" (جب وہ شخص اپنی پوری قوت' اپنی پختگی کو پہنچ گیا)۔ تو نسل انسانی بحیثیت مجموعی دو اعتبارات سے ایک بلوغ اور پختگی کو پہنچی ہے اُس وقت جبکہ محمدؐ رسول اللہ ﷺ کی بعثت ہوئی۔ انسانی ذہن اور اس کے فکر و شعور کے ارتقاء کا ایک عمل مسلسل جاری رہا ہے۔ اور جس طرح ایک بچے پر عہدِ طفولیت کے بعد لڑکپن' جوانی اور عقل کی پختگی کے سارے ادوار آتے ہیں اسی طرح نسل انسانی ان تمام مراحل سے گزری ہے۔ انسان کو کامل اور مکمل ہدایت روزِ اوّل سے نہیں دی جاسکتی تھی۔ اس لئے نہیں کہ "نعوذ باللہ من ذالک" اس وقت اللہ کے پاس تھی نہیں۔ اللہ کے پاس تو تھی' لیکن انسان ابھی اس قابل نہ تھا کہ اس کو حاصل کر سکتا۔ ذہنی اور فکری اعتبار سے وہ ابھی اس سطح تک نہ پہنچا تھا کہ اس کو ابدی ہدایت نامے کا اہل سمجھا جاتا۔ لہٰذا عبوری دور میں ہدایات دی جاتی رہیں' کتابیں نازل

ہوتی رہیں، صحیفے اترتے رہے، ابتدائی احکام دیئے جاتے رہے، تا آنکہ انسان اپنی عقل و شعور کی پختگی کو پہنچ گیا۔ اور فکر کی سطح کے اعتبار سے اس کا اہل ہو گیا کہ ابدی ہدایت نامہ اب اسے دے دیا جائے۔ یہ وہ وقت ہے جبکہ محمدؐ رسول اللہ ﷺ کی بعثت ہوئی ہے۔

نوعِ انسانی کی ذہنی و فکری بلوغت کا دَور

میں یہاں پروفیسر یوسف سلیم چشتی صاحب کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جو اگرچہ معروف تو کچھ دوسرے اعتبارات سے تھے، انہوں نے علامہ اقبال کی کتابوں کی شرحیں بھی لکھی ہیں، لیکن واقعہ یہ ہے کہ میں اپنی زندگی میں جن لوگوں سے مل سکا ہوں ان میں مجھے اپنے محدود علم کے مطابق فلسفہ، تاریخ فلسفہ، تاریخ مذاہب اور منطق وغیرہ میں مطالعہ کی وسعت اور گہرائی کے اعتبار سے کوئی دوسرا شخص ان کی ٹکر کا نہیں ملا۔ انہوں نے ایک روز بر سبیل تذکرہ یہ بات کہی کہ نسل انسانی کی تاریخ کے بارہ سو برس بڑے اہم اور بہت productive ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان بارہ سو سال کے دَوران انسان جو کچھ سوچ سکتا تھا سوچ چکا اور اس کی سوچ اپنی پختگی کو پہنچ چکی۔ یہ ہیں چھ سو قبل مسیح سے لے کر چھ سو بعد مسیح تک کے بارہ سو برس، جن کے دَوران تمام مکتبہ ہائے فکر، تمام مدارسِ فلسفہ اور تمام مذاہب جو بھی پیدا ہونے تھے ہو چکے، اس کے بعد کوئی نیا مذہب اور کوئی نیا فلسفہ وجود میں نہیں آیا۔ دَورِ حاضر میں یہ سارے جو نام لئے جاتے ہیں اور بڑی بھاری بھرکم اصطلاحات میں جو نئے فلسفے مغرب کے سمجھے جاتے ہیں، وہ logical positivism ہو یا existentialism ہو، یہ سب نئے لیبلوں سے نئی بوتلوں میں پرانی شرابوں کے سوا کچھ نہیں۔ انسان جو کچھ بحیثیتِ انسان سوچ سکتا تھا وہ چھ سو بعد مسیح تک سوچ چکا تھا اور اس کی فکر پختہ ہو چکی تھی۔ چشتی صاحب مرحوم سے یہ بات سن کر میرا ذہن فوراً منتقل ہوا کہ اگر یہ حقیقت ہے تو واقعہ یہ ہے کہ اس کا گہرا تعلق ہے بعثتِ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے لئے زمانے اور وقت کے تعیّن کے ساتھ کہ جب انسان سوچ چکا جو کچھ کہ وہ سوچ سکتا تھا۔ سقراط، ارسطو اور افلاطون اپنے نظریات دنیا کے سامنے رکھ چکے۔ فلاسفہ ہند نے عقل کی جو بھی جولانیاں ہو سکتی تھیں وہ دکھالیں۔

فلاسفۂ یونان اور فلاسفۂ چین اور ایران انسان کو جو کچھ دے سکتے تھے دے چکے۔ تب وہ الکتاب اور الھدیٰ اس دعوے کے ساتھ نازل ہوئی کہ یہ ہدایتِ تامہ ہے' یہ آخری اور مکمل ہدایت ہے جو اب انسان کو دی جا رہی ہے۔ اور آپ غور کیجئے' اس سے بڑا گہرا تعلق ہے اس حقیقت کا کہ اس کتاب کی حفاظت کا ذمہ اللہ نے لیا ہے' از روئے الفاظ قرآنی : ﴿اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ﴾ سوچئے' تورات بھی اللہ ہی کی کتاب تھی' اگر اللہ اس کی حفاظت کا ذمہ لیتا تو کیا اس میں تحریف ممکن ہوتی؟ بلکہ میں اس کے برعکس یوں کہوں گا کہ اگر قرآن کی حفاظت کا ذمہ اللہ نے نہ لیا ہوتا تو کیا ہم قرآن مجید کو بخش دیتے! کیا اُمّتِ مسلمہ اس میں تحریف نہ کر دیتی؟ کیا معنوی تحریف ہمارے ہاں نہیں ہوئی؟ یہ حفاظت خصوصی قرآن کو دی گئی اور تورات' زبور اور انجیل کو نہ دی گئی اس کا کیا سبب ہے؟ میں کہا کرتا ہوں کہ ان کتابوں کو یہ حق حاصل ہے کہ اللہ کی جناب میں یہ شکوہ کریں کہ پروردگار! یہ ہم سے سوتیلی بیٹیوں والا معاملہ کیوں ہوا؟ ہم بھی تیری کتابیں تھیں' ہمیں تو نے تحفظ کیوں نہ دیا؟ تو اس کا جواب یہی ہے کہ یہ ابھی عبوری دَور کی ہدایات تھیں جب نسل انسانی ابھی عقل اور شعور کی منزلیں طے کر رہی تھی۔ اس عبوری دَور کی حفاظت لازمی نہ تھی۔ ان کو مستقل بنانا اور محفوظ رکھنا ضروری نہ تھا۔ یوں سمجھئے کہ ایک ہی کتاب ہے جس کے سابقہ ایڈیشن پہلے دیئے گئے اور اسی کا کامل اور مکمل آخری ایڈیشن ہے جو محمدؐ رسول اللہ ﷺ کو دیا گیا۔

اجتماعی شعور کی پختگی

اب آیئے دوسرے مضمون کی طرف "دِیْنِ الْحَق" کے الفاظ میں درحقیقت نسل انسانی کے ایک اور اعتبار سے بلوغ کو پہنچنے کی طرف اشارہ بھی ہے۔ اس سے پہلے بھی بعض مقامات پر اشارے کئے گئے ہیں کہ انسان نے انفرادیت سے تدریجاً اجتماعیت کا سفر طے کیا ہے۔ کبھی صرف ایک قبیلے کی زندگی تھی' پھر شہری ریاستیں وجود میں آئیں' پھر بڑی بڑی مملکتیں اور سلطنتیں قائم ہوئیں۔ یہ عظیم سلطنتوں کا دَور تھا جب محمدؐ رسول اللہ ﷺ مبعوث ہوئے۔ اس وقت قیصر و کسریٰ کی عظیم سلطنتیں قائم تھیں جن کے مابین تاریخ کئی

سو برس سے جھولا جھول رہی تھی۔ ان سلطنتوں کی لکھوکھا کی تعداد میں standing armies تھیں۔ یہ تربیت یافتہ مسلح افواج تھیں۔ یہ وہ دَور تھا جبکہ محمدِ عربی ﷺ کی بعثت ہوئی ہے۔ گویا کہ انسان اجتماعی اعتبار سے بھی اب اس سطح پر آگیا تھا کہ اس کی ضرورت اب ایک اجتماعی نظام کی تھی۔ صرف انفرادی اخلاقیات اب اس کی ضروریت کی کفالت نہ کرسکتے تھے۔ انفرادی اخلاقیات کے اعتبار سے حضرت مسیح علیہ السلام کہیں پیچھے نہیں ہیں۔ لیکن اب ضرورت تھی ایک اجتماعی نظام کی' ایک ایسے نظامِ عدل و قسط کی جس میں انسانی زندگی کے جو بھی متصادم (conflicting) تقاضے ہیں ان کو اس طریقے سے سمو دیا جائے کہ ان میں اعتدال بھی ہو اور توازن بھی ہو' کوئی تقاضا کسی دوسرے تقاضے کے نیچے دب نہ جائے' انفرادیت بھی مجروح نہ ہو اور اجتماعیت کے حقوق بھی محفوظ رہیں۔ مرد کی قوامیت بھی مجروح نہ ہو اور عورت کے حقوق بھی اس طرح پامال نہ ہو جائیں کہ وہ بھیڑ بکری کی طرح صرف ملکیت بن کر رہ جائے۔ اسی طریقے سے زندگی کے اندر جو مختلف پیچیدگیاں پیدا ہو چکی تھیں اور جو مختلف نزاعات وجود میں آچکے تھے انہان کو ان سب کا ایک معتدل اور متوازن حل درکار تھا۔ یہ ہے اس دور کے انسان کی اصل ضرورت! اور محمدؐ رسول اللہ ﷺ نے انسان کی اس ضرورت کو پورا کیا۔ وہ ایک دین لے کر آئے' ایک نظام لے کر آئے۔ یہ نظام اجتماعی زندگی کے تمام تقاضوں کو پورا کرنے والا نظام ہے اور یہ توازن اور اعتدال کی ایک عجیب کیفیت اپنے اندر لئے ہوئے ہے۔ یہی توازن اور اعتدال ہے جس کی وجہ سے سورۃ الحدید میں اس دین حق کو "المیزان" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یہ میزان ہے' یہ تول دینے والی شے ہے' افراد کے حقوق کو معین کرنے والی' عورت اور مرد کے حقوق و اختیارات اور فرائض کو معین کرنے والی اور تول دینے والی۔ یہ فرد اور اجتماعیت کے مابین اور سرمائے اور محنت کے مابین توازن پیدا کرنے والی میزان ہے' جو محمدؐ رسول اللہ ﷺ کو دین حق کی شکل میں دے کر بھیجا گیا۔

لِیُظْهِرَهٗ کا مفہوم

اس کا لفظی ترجمہ ہو گا "تا کہ وہ غالب کر دے اس کو"۔ اس میں جو ضمیریں وارد ہوئی ہیں ان کے بارے میں مفسرین کے ہاں ایک سے زائد آراء موجود ہیں۔ چنانچہ اس لفظ کا ہمیں تفصیلاً تجزیہ کرنا ہو گا۔ ایک ترجمہ اس کا یہ کیا گیا ہے کہ "تا کہ اللہ غالب کر دے اس دین کو"۔ اسی طرح یہ ترجمہ بھی کیا گیا ہے کہ "تا کہ اللہ غالب کر دے محمد (ﷺ) کو"۔ اور ایک ترجمہ یوں بھی کیا گیا ہے "تا کہ محمدؐ غالب کر دیں اس دین کو!" ضمیر فاعلی اور ضمیر مفعولی کے مراد مختلف معین کرنے کی وجہ سے در حقیقت ترجموں میں یہ فرق واقع ہوا ہے۔ لیکن غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس لفظی فرق کے باوجود اس کے اصل مفہوم اور معنی میں ہرگز کوئی فرق واقع نہیں ہوتا۔ لفظ "اظہار" پر غور کیجئے۔ ظَهَرَ یَظْهَرُ کا مفہوم ہے کسی چیز کا ظاہر ہو جانا۔ اور اسی میں ایک مفہوم غالب ہو جانے کا بھی شامل ہے، اس لئے کہ کوئی چیز نمایاں اور ظاہر اس وقت ہوتی ہے جب کہ وہ اپنے ماحول پر غالب ہوتی ہے۔ اسی سے بابِ افعال میں مصدر بنا "اظہار" یعنی غالب کر دینا۔ اس کو اس طرح بھی سمجھا جا سکتا ہے کہ عربی زبان میں ظھر کہتے ہیں پیٹھ کو۔ کسی کی پیٹھ پر سوار ہو جانا اس پر غالب ہونے کے مترادف ہے۔ تو اظہار کا یہ مفہوم مسلّم ہے۔

لِیُظْهِرَهٗ کی ضمیرِ فاعلی کے بارے میں جو دو رائیں ہیں ان پر غور کرنے سے معلوم ہو گا کہ ان کا مدلول ایک ہی ہے۔ چنانچہ "غالب کرنے والا" خواہ اللہ کو قرار دیا جائے خواہ رسول ﷺ کو، حقیقت کے اعتبار سے کوئی فرق واقع نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ ہمارا یہ ایمان ہے کہ فاعلِ حقیقی تو صرف اللہ ہی ہے۔ اگرچہ اس دنیا میں بظاہر ہم محنت و مشقت سے روزی کماتے ہیں، لیکن ہمارا رازق اللہ ہی ہے۔ انسان تو محض کاسبِ اعمال ہے، خالقِ اعمال صرف اللہ ہے۔ چنانچہ اس عمل "اظہار" کے کرنے والے عالمِ اسباب میں محمدؐ رسول اللہ ﷺ ہیں، اور عالمِ حقیقت میں اس کا فاعل اللہ ہے۔ لہٰذا مراد اور معنی کے اعتبار سے ان دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ جس طرح کہ سورۃ الانفال میں غزوۂ بدر کے حالات پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ﴿فَلَمْ تَقْتُلُوْهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمْ وَمَا رَمَيْتَ اِذْ

رَمَیْتَ وَلٰکِنَّ اللّٰہَ رَمٰی ﴾ کہ اے مسلمانو! یہ ستّر سردارانِ قریش جو تمہارے ہاتھوں واصلِ جہنم ہوئے ہیں' انہیں تم نے قتل نہیں کیا' بلکہ درحقیقت اللہ نے انہیں قتل کیا ہے' اور اے نبی وہ مٹھی بھر کنکر جو آپ نے پھینکے تھے لشکر کفار کی طرف تو وہ آپ نے نہیں پھینکے تھے' اللہ نے پھینکے تھے۔ معلوم ہوا کہ عالم واقعہ میں یا بالفاظِ دیگر عالم اسباب میں غلبۂ دین کے لئے محنت' جدوجہد' سرفروشی اور جہاد و قتال کرتے نظر آتے ہیں محمد ﷺ اور آپؐ کے جاں نثار' لیکن حقیقت کی سطح پر فاعل حقیقی صرف اللہ ہے۔ اسی طرح کا معاملہ لِیُظْھِرَہٗ میں شامل ضمیر مفعولی کا ہے۔ چنانچہ اس سے خواہ دین کو غالب کرنا مراد لیا جائے چاہے محمد رسول اللہ ﷺ کی ذاتِ گرامی کو' مفہوم میں کوئی فرق واقع نہیں ہو گا۔ اس لئے کہ آنحضور ﷺ کی جدوجہد کا مقصود ہرگز اپنی ذات کا غلبہ نہ تھا۔ یہ بھاگ دوڑ اور سعی و جہد اپنی یا اپنے خاندان کی حکومت قائم کرنے کیلئے ہرگز نہ تھی۔ رسول اللہ ﷺ کا غلبہ درحقیقت اللہ کے دین کا غلبہ تھا۔ لہٰذا لفظی ترجمہ چاہے جو بھی کیا جائے اور ضمیروں کے مراجع کے بارے میں خواہ کوئی بھی رائے قائم کی جائے' مفہوم ایک ہی رہے گا۔

اب تک اس آیۂ مبارکہ میں جو کچھ مضمون آیا ہے اسے ذہن میں تازہ کر لیجئے۔ اللہ نے بھیجا اپنے رسول کو دو چیزیں دے کر (۱) الھدیٰ اور (۲) دین حق۔ کیوں بھیجا؟ اس کا جواب درحقیقت اس لفظ لِیُظْھِرَہٗ میں بیان ہوا ہے۔ اس لئے بھیجا تاکہ اس دین حق کو غالب کر دے پورے نظامِ زندگی پر (عَلَی الدِّیْنِ کُلِّہٖ)۔ لفظ دین کے ترجمہ میں بھی ہمارے ہاں کچھ اختلاف رہا ہے۔ بعض لوگوں نے "تمام ادیان" ترجمہ کر دیا ہے' بعض نے "سب دین" ترجمہ کیا ہے' اسی طرح بعض لوگوں نے اس سے "کل دین" اور بعض نے "جنس دین" مراد لیا ہے۔ یہ مؤخر الذکر ترجمہ درحقیقت اصل مفہوم سے سب سے زیادہ قریب ہے۔ گویا اس کا اصل مفہوم اور معنی یہ ہو گا کہ یہ دین حق غالب ہو جائے پورے جنس دین پر' پورے نظام زندگی پر اللہ کا نظام اس شان سے قائم ہو جائے کہ انسانی زندگی کا کوئی گوشہ اس سے مستثنیٰ نہ رہے۔ اللہ کا عطا کردہ نظامِ عدل و قسط زندگی پر بحیثیت ایک وحدت اور ایک "organic whole" کے نافذ و غالب ہو جائے۔ یہ ہے مقصد محمدؐ رسول اللہ ﷺ کی بعثت کا۔

"دین" اور "مذہب" میں فرق

یہاں یہ بات بھی ذہن میں رکھئے کہ لفظ "مذہب" اور لفظ "دین" میں مفہوم کے اعتبار سے بڑا فرق ہے۔ اگرچہ ہمارے ہاں عام طور پر اسلام کو مذہب کہا جاتا ہے' لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ پورے قرآن مجید میں اور حدیث کے پورے ذخیرے میں اسلام کے لئے مذہب کا لفظ کہیں استعمال نہیں ہوا' بلکہ اس کے لئے ہمیشہ "دین" ہی کا لفظ مستعمل ہوا ہے۔ سورۃ آلِ عمران میں فرمایا گیا : ﴿اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ﴾ کہ اللہ کی بارگاہ میں مقبول دین تو صرف اسلام ہے۔ دین اور مذہب میں بنیادی فرق کو سمجھ لیجئے! مذہب ایک جزوی حقیقت ہے۔ یہ صرف چند عقائد (dogma) اور کچھ مراسم عبودیت (rituals) کے مجموعے کا نام ہے۔ جبکہ دین سے مراد ہے ایک مکمل نظام جو زندگی کے تمام پہلوؤں پر حاوی ہو۔ گویا مذہب کے مقابلے میں دین ایک بڑی اور جامع حقیقت ہے۔ اس پس منظر میں اگرچہ یہ کہنا تو شاید درست نہ ہو گا کہ اسلام مذہب نہیں ہے' اس لئے کہ مذہب کے جملہ elements بھی اسلام میں شامل ہیں' اس میں عقائد کا عنصر بھی ہے' ایمانیات ہیں' پھر اس کے مراسم عبودیت ہیں' نماز' روزہ ہے' حج اور زکوٰۃ ہے' چنانچہ صحیح یہ ہو گا کہ یوں کہا جائے کہ اسلام صرف ایک مذہب نہیں' ایک دین ہے۔ اس میں جہاں مذہب کا پورا خاکہ موجود ہے وہاں یہ ایک مکمل نظامِ زندگی بھی ہے۔ بلکہ اصلاً یہ دین ہے۔

اب اس حوالے سے ایک اہم حقیقت پر غور کیجئے! کسی ایک خطۂ زمین میں مذاہب تو بیک وقت بہت سے ہو سکتے ہیں' لیکن دین ایک وقت میں صرف ایک ہی ہو سکتا ہے۔ نظام تو ایک ہی ہو گا۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ سرمایہ درانہ نظام اور اشتراکی نظام کسی خطۂ زمین پر یا کسی ایک ملک میں بیک وقت قائم ہوں! حاکمیت (Sovereignty) تو کسی ایک ہی کی ہو گی۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ ملوکیت اور جمہوریت دونوں بیک وقت کسی ملک میں نافذ ہو جائیں۔ نظام ایک ہی رہے گا۔ اللہ کا نظام ہو گا یا غیر اللہ کا ہو گا۔ نظام دو نہیں ہو سکتے'

جبکہ ایک خطۂ زمین میں مذاہب بیک وقت بہت سے ممکن ہیں[1] ہاں نظاموں کے ضمن میں ایک امکانی صورت پیدا ہو سکتی ہے کہ ایک نظام غالب و برتر ہو' اور وہی حقیقت میں "نظام" کہلائے گا' اور دوسرا نظام سمٹ کر اور سکڑ کر ایک مذہب کی شکل اختیار کر لے اور اس کے تابع زندگی گزارنے پر آمادہ ہو جائے۔ یہ ہے درحقیقت ایک امکانی حالت! میرا ذہن منتقل ہوا علامہ اقبال کے اس شعر کی طرف کہ ؎

بندگی میں گھٹ کے رہ جاتی ہے اک جوئے کم آب
اور آزادی میں بحرِ بیکراں ہے زندگی!

دین کب مذہب کی شکل اختیار کرتا ہے؟

دین جب مغلوب ہوتا ہے تو ایک مذہب کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اس صورت میں وہ دین نہیں رہتا' بلکہ مذہب بن جاتا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے کہ اسلام کے دورِ عروج میں غالب نظام تو اسلام کا تھا' لیکن اس دین کے تابع یہودیت' مجوسیت اور نصرانیت مذاہب کی حیثیت سے برقرار تھے۔ انہیں یہ رعایت دی گئی تھی اور صاف الفاظ میں سنا دیا گیا تھا کہ اگر وہ اسلامی حدود کے اندر رہنا چاہتے ہیں تو انہیں اپنے ہاتھ سے جزیہ دینا ہو گا اور چھوٹے بن کر رہنا ہو گا ﴿ يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَدٍ وَهُمْ صَاغِرُونَ ﴾ (التوبۃ : ۲۵) ملکی قانون (law of the land) اللہ کا ہو گا' غالب نظام اللہ کا ہو گا' اس کے تحت اپنے پرسنل لاء میں اور اپنی ذاتی زندگی میں محدود سطح پر وہ اگر اپنے مذاہب اور اپنے عقائد و رسوم کے مطابق زندگی بسر کرنا چاہیں تو اس کی انہیں اجازت ہو گی۔ اسلام کے دورِ زوال و انحطاط میں یہ صورت برعکس ہو گئی۔ یوں کہا جا سکتا ہے کہ اس برصغیر میں دین انگریز کا تھا' law of the land اس کا تھا۔ دینِ انگریز کے تحت اسلام نے سمٹ کر ایک مذہب کی صورت اختیار کر لی تھی کہ نمازیں جیسے چاہو پڑھو' انگریز کو کوئی اعتراض نہ تھا' اذانیں

---

[1] یہ بات اس حقیقت سے بہت مشابہ ہے جو ایک کہاوت کے طور پر بیان کی جاتی ہے کہ دس درویش ایک گدڑی میں گزارا کر سکتے ہیں لیکن دو بادشاہ ایک سلطنت میں اکٹھے نہیں رہ سکتے!

بخوشی دیتے رہو' وراثت اور شادی بیاہ کے معاملات بھی اپنے اصول کے مطابق طے کرلو' لیکن ملکی قانون انگریز کی مرضی سے طے ہو گا۔ یہ معاملہ تاجِ برطانیہ کی sovereignty کے تحت ہو گا' اس میں تم مداخلت نہیں کر سکتے! یہ تھا وہ تصور جس کے بارے میں اقبال نے بڑی خوبصورت پھبتی چست کی تھی ؎

ملّا کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت
ناداں یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد!

یعنی اسلام آزاد کہاں ہے؟ وہ سمٹ سکڑ کر اور اپنی اصل حقیقت سے بہت نیچے اتر کر ایک مذہب کی شکل میں باقی ہے! اللہ اللہ اور خیر سلا۔

نفاذِ دین کے بغیر اتمامِ حجّت ممکن نہیں!

دین ہے ہی وہ کہ جو غالب ہو۔ اگر مغلوب ہے تو وہ دین نہیں رہے گا' بلکہ ایک مذہب کی صورت میں سمٹ جائے گا' اور سکڑ جائے گا' اس کی اصل حیثیت مجروح ہو جائے گی۔ اس پہلو سے غور کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ اعلیٰ سے اعلیٰ نظامی بھی اگر صرف نظری اعتبار سے پیش کیا جا رہا ہو' صرف کتابی شکل میں نسل انسانی کو دیا گیا ہو تو وہ ایک خیالی جنت (utopia) کی شکل تو اختیار کر سکتا ہے' لیکن حجت نہیں بن سکتا۔ نوعِ انسانی پر حجت وہ صرف اس وقت بن سکتا ہے جب اسے قائم کر کے' نافذ کر کے اور چلا کر دکھا دیا جائے۔ یہ ہے بعثت نبویؐ کی وہ امتیازی شان اور کٹھن ذمہ داری جو محمدؐ رسول اللہ ﷺ پر عائد ہوئی کہ آپؐ جو دین حق دے کر بھیجے گئے ہیں اسے پورے نظامِ زندگی پر غالب و قائم اور نافذ و رائج فرما دیں۔ ایک حدیث مبارک میں اس حقیقت کو یوں تعبیر فرمایا گیا کہ ((لِتَکُوْنَ کَلِمَۃُ اللّٰہِ ھِیَ الْعُلْیَا)) تاکہ اللہ کی بات ہی سب سے بلند ہو' اس کی مرضی سب سے بالاتر ہو اور اس کا جھنڈا سب سے اونچا ہو جائے۔

سورۃ المدّثر میں اس اہم مضمون کو دو الفاظ میں سمو لیا گیا ہے ﴿یٰٓاَیُّھَا الْمُدَّثِّرُ ۝ قُمْ فَاَنْذِرْ ۝ وَرَبَّکَ فَکَبِّرْ ۝﴾ کہ اے لحاف میں لپٹ کر لیٹنے والے (ﷺ) کھڑے ہو جاؤ! کمر بستہ ہو جاؤ' اپنے مشن کی تکمیل کے لئے جدوجہد کا آغاز کرو! اور اس کا نقطہ آغاز کیا ہے؟

انذار۔ خبردار کرو' اُن نیند کے ماتوں کو جگاؤ' جو بھول گئے ہیں اس حقیقت کو کہ اصل زندگی موت کے بعد ہے ﴿ وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴾ "اور یقیناً آخرت کا گھر ہی اصل زندگی ہے' کاش کہ انہیں معلوم ہوتا"۔ یہ ہے نبیؐ کے مشن کا نقطۂ آغاز! اور اس کا ہدف مقصود اور اس کی غایت قصویٰ کیا ہے؟ ﴿ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ﴾ "اور اپنے رب کو بڑا کرو!" تکبیر کے معنی صرف یہ نہیں کہ بڑائی کا اعلان یا اعتراف کر لیا جائے' زبان سے اللہ اکبر کہہ دیا جائے' بلکہ تکبیر سے مقصود یہ ہے کہ اس کی بڑائی نافذ کی ہو جائے' اس کی کبریائی کے اعتراف پر مبنی نظام بالفعل قائم ہو جائے' اسی کی بات سب سے اونچی اور اسی کا حکم سب سے بالا ہو۔ یہ ہے تکبیر رب کا حقیقی مفہوم! علامہ اقبال نے بڑے خوبصورت انداز میں تکبیر رب کے اس انقلابی تصور کو شعر کا لبادہ اوڑھایا ہے ؎

یا وسعتِ افلاک میں تکبیرِ مسلسل
یا خاک کی آغوش میں تسبیح و مناجات
وہ مسلکِ مردانِ خود آگاہ خدا مست
یہ مذہبِ ملّا و جمادات و نباتات

اسی مضمون کو کسی قدر ظریفانہ انداز میں یوں بیان کیا ؎

پرواز ہے دونوں کی اسی ایک فضا میں
کرگس کا جہاں اور ہے شاہیں کا جہاں اور

الفاظ و معانی میں تفاوت نہیں لیکن
ملّا کی اذاں اور مجاہد کی اذاں اور

تکبیرِ رب کا کچھ یہی مفہوم حضرت مسیح علیہ السلام کے ان الفاظ میں بھی سامنے آتا ہے کہ "اے رب! جیسے تیری مرضی آسمانوں پر پوری ہوتی ہے ویسے ہی زمین پر بھی پوری ہو۔"

دین حق کا نفاذ انقلابی جدّوجُہد کا متقاضی ہے

یہ بات ذہن میں رکھئے کہ سورۃ الصّف کی زیر نظر آیت کے حوالے سے نبی اکرم ﷺ کا جو مشن سامنے آتا ہے اس کا تقاضا محض دعوت و تبلیغ' بشارت و انذار یا تعلیم و

تربیت سے ہرگز پورا نہیں ہوتا۔ اس کے تقاضے کچھ اور ہیں۔ یہ ایک انقلابی مشن ہے۔ ایک نظام کو کسی معاشرے پر برپا کرنا اس کے بغیر ممکن نہیں کہ پہلے وہاں پر موجود نظام کو جڑوں سے اکھیڑا جائے۔ یہ کام خلا میں کیا جانے والا نہیں ہے۔ جہاں بھی دین حق کے نفاذ کی جدّوجہد کی جائے گی کوئی نہ کوئی نظام وہاں پہلے سے موجود ہو گا۔ اس باطل نظام کے ساتھ لوگوں کے مفادات وابستہ ہوں گے۔ سیادتیں اور چودھراہٹیں ہوں گی' لوگوں کے مالی مفادات ہوں گے۔ آپ جب اُس نظام کو ذرا سا چھیڑیں گے' اس کے خلاف ذرا آواز بلند کریں گے تو نہ معلوم کس کس کے کن کن مفادات پر آنچ آئے گی! چنانچہ وہ تمام قوتیں اپنے اس نظام کی مدافعت میں آپ کے خلاف متحد ہو جائیں گی کہ ؎

"نظامِ کہنہ کے پاسبانو' یہ معرضِ انقلاب میں ہے!"

اپنے نظام کو برقرار رکھنے اور اپنے مفادات کے تحفظ کی خاطر وہ سب مجتمع ہو کر آپ کے خلاف صف آراء ہو جائیں گے۔ تصادم' کشمکش اور جہاد و قتال کا مرحلہ لازماً آکر رہے گا۔ چنانچہ اس مقصد بعثت کے اعتبار سے جو سورۃ الصف کی اس آیت میں محمد رسول اللہ ﷺ کی بعثت کے لئے معین ہوا ہے' انقلابی جدّوجُہد لازم اور ناگزیر ہے۔ یہ محض دعوت و تبلیغ سے ہونے والی بات نہیں!

اگرچہ سورۃ الجمعہ کے حوالے سے اگلے درس میں یہ بات آئے گی کہ اس انقلابی جدّوجہد کا منہج اساسی یقیناً دعوت و تبلیغ ہے' اس کے ابتدائی مراحل میں یقیناً تعلیم بھی ہے' تربیت بھی ہے اور تزکیہ بھی ہے' لیکن ان ابتدائی اور اساسی مراحل سے بلند تر سطح پر ایک انقلابی جدوجہد بھی ناگزیر ہے۔ ایک تصادم کہ جس میں کشت و خون کی نوبت بھی آسکتی ہے۔ نبی اکرم ﷺ کی سیرتِ طیبہ میں جہاں ہمیں دعوت و تبلیغ کا مرحلہ نظر آتا ہے وہاں جہاد و قتال کے مراحل بھی آئے۔ حنین کی وادی میں آپ یہ رجز پڑھتے ہوئے اپنے لشکر کی کمان کرتے اور آگے بڑھتے نظر آتے ہیں "اَنَا النَّبِیُّ لَا کَذِبْ ' اَنَا ابْنُ عَبْدِ الْمُطَّلِبْ" یہ وہ بات ہے جو اُن لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتی جنہوں نے حضور ﷺ کے مقصد بعثت کی اس منفرد اور امتیازی شان کو نہیں سمجھا کہ آپ صرف داعی اور مبلغ نہ تھے' آپ محض مبشر اور نذیر نہ تھے' آپ صرف مزکی' مربی اور معلم نہ تھے' آپ تاریخ انسانی کے

عظیم ترین انقلاب کے داعی اور نقیب بھی تھے۔ کون انکار کر سکتا ہے اس حقیقت سے کہ تاریخ انسانی کا عظیم ترین انقلاب وہ ہے جو محمدؐ رسول اللہ ﷺ نے برپا فرمایا' جس نے زندگی کے ہر گوشے کو بدل کر رکھ دیا۔ ایسا ہمہ گیر انقلاب جس نے لوگوں کے افکار بدلے' عقائد بدلے' نظریات بدلے' کردار بدلے' حتیٰ کہ لوگوں کے شب و روز کے انداز اور نشست و برخاست کے طریقے بدل گئے۔ وہ قوم کہ جس کے اندر کوئی کسی کی بات سننے والا نہ تھا' انتہائی منظم قوم بن گئی۔ اس معاشرہ نے کہ جہاں پڑھنے لکھنے والے لوگ انگلیوں پر گنے جانے کے قابل تھے' دنیا کو معلم فراہم کیے۔ نبی اکرم ﷺ نے نوعِ انسانی کو ایک نئی تہذیب اور ایک نیا تمدن عطا کیا۔ بلاشبہ یہ تاریخ انسانی کا عظیم ترین انقلاب تھا۔ حضور ﷺ کی بعثت کا یہ پہلو کہ آپؐ عظیم داعی انقلاب تھے' درحقیقت آپؐ کے اس فرضِ منصبی کا تقاضا ہے جو اِن الفاظ مبارکہ میں بیان ہوا ﴿ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ﴾

"اس راہ میں جو سب پہ گزرتی ہے سو گزری!"

مہاتما گاندھی کے بارے میں غالباً جارج برنارڈ شا نے یہ تاریخی الفاظ کہے تھے کہ :

"He is a saint among politicians and a politician among saints"

اگرچہ ع "چہ نسبت خاک را با عالمِ پاک" کے مصداق ان الفاظ کی یا ان جیسے الفاظ کی کوئی دور کی نسبت بھی آنحضور ﷺ کی ذاتِ گرامی سے نہیں ہو سکتی، تاہم واقعہ یہ ہے کہ سیرتِ نبویؐ کے فہم کے لئے شاید اگر یوں تعبیر کیا جائے تو بات غلط نہ ہو گی کہ :

He was a revolutionary among prophets and a prophet among revolutionaries

یعنی نبیوں اور رسولوں میں آپؐ کی امتیازی شان یہ ہے کہ آپؐ ایک عظیم انقلابی رہنما ہیں' اور انقلابی رہنماؤں میں آپؐ کی منفرد شان یہ ہے کہ آپؐ اللہ کے نبی اور رسول ہیں۔ آپؐ نے صرف دعوت و تبلیغ کا کام نہیں کیا بلکہ اس دعوت کی بنیاد پر ایک انقلاب کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔ دعوت و تبلیغ کے ابتدائی مرحلے سے کام کا آغاز کیا اور کل ۲۳

برس میں اس جدوجہد کو ایک نظام کے باقاعدہ قیام اور باضابطہ نفاذ کے تکمیلی مرحلے تک پہنچادیا۔ اگرچہ یہ امر واقعہ ہے کہ اس جدوجہد میں آپؐ کو ان تمام مراحل سے گزرنا پڑا جو کسی بھی انقلابی جدوجہد میں آتے ہیں۔ زمین پر قدم بقدم چل کر حضور ﷺ نے وہ مرحلے طے کیے۔ آپؐ کو فقروفاقے کی صعوبت بھی برداشت کرنا پڑی، شعبِ بنی ہاشم میں تین سال کی قید کو ذہن میں لائیے کہ جس میں وہ وقت آیا کہ فقروفاقے کی شدت سے بنی ہاشم کے دودھ پیتے بچے بلک رہے تھے اور ان کے کھانے کے لئے کوئی چیز میسر نہ تھی، سوائے اس کے کہ سوکھے چمڑوں کو اُبال کر اس کا پانی ان کے حلق میں ٹپکا دیا جائے۔ طائف میں شدید پتھراؤ کا آپ ﷺ کو سامنا کرنا پڑا۔ مکے کی گلیوں میں آپ ﷺ کے راستے میں کانٹے بچھائے جاتے تھے۔ یہ منظر بھی چشم فلک نے دیکھا کہ آپ ﷺ سربسجود ہیں اور ایک شقی انسان عقبہ بن ابی معیط ابوجہل کے کہنے سے اٹھتا ہے اور اونٹ کی نجاست بھری اوجھری لاکر شانۂ مبارک پر رکھ دیتا ہے۔ پھر غارِ ثور کا مرحلہ بھی آیا۔ میدان بدر کا وہ نقشہ بھی ذہن میں لائیے کہ اللہ کا رسولؐ دونوں لشکروں کے درمیان گھاس پھونس کی ایک جھونپڑی میں سربسجود ہے اور اللہ سے گڑگڑا کر نصرت کی درخواست کررہا ہے۔ پھر اُحد کا سخت مرحلہ بھی آیا۔ آپؐ کے دندان مبارک شہید اور چہرۂ انور لہولہان ہوگیا ہے۔ آپؐ پر کچھ دیر کے لئے غشی طاری ہوجاتی ہے۔ آپؐ کے انتہائی جاں نثار ساتھی حضرت مصعب بن عمیرؓ کا لاشہ بے گوروکفن پڑا ہے کہ جسم پر موجود چادر اتنی چھوٹی تھی کہ اگر سر کو ڈھانپتے تو پاؤں کھل جاتے اور پاؤں کو ڈھانپتے تو سر کھل جاتا تھا۔ حضور ﷺ کے سامنے یہ مسئلہ پیش کیا گیا تو آپؐ نے فرمایا کہ سر کو چادر سے ڈھانپ دو اور پاؤں پر گھاس ڈال دو۔ اسی میدانِ اُحد میں آپؐ کے انتہائی قریبی عزیز حضرت حمزہؓ بن عبدالمطلب کا اعضاء بریدہ لاشہ پڑا ہوا ہے۔ حضور ﷺ کے قلبِ مبارک کی جو کیفیت ہے اس کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ مدینہ پہنچنے پر جب آپؐ نے دیکھا کہ گھر گھر سے رونے کی آوازیں آرہی ہیں، شہداء پر اُن کی رشتہ دار خواتین بین کر رہی ہیں، تو حضور ﷺ کی زبان سے بے اختیار یہ الفاظ آگئے: ((اَمَّا حَمْزَةُ فَلَا بَوَاكِيَ لَهُ)) "ہائے حمزہ کے لئے تو کوئی رونے والی بھی نہیں۔" یہ تمام صدمے حضور ﷺ نے

دیکھے اور یہ سب سختیاں جھیلی ہیں' تب یہ انقلاب آیا ہے۔ گویا ع "اس راہ میں جو سب پہ گزرتی ہے سو گزری" کے مصداق اس عظیم انقلابی جدّوجُہد میں نبی اکرم ﷺ کو اِن تمام مراحل اور مشکلات و موانع کا سامنا کرنا پڑا جو دنیا کی کسی بھی انقلابی جدّوجہد میں پیش آتے ہیں۔ بہرکیف یہاں صرف اس بات کی طرف اشارہ مقصود ہے کہ بعثت محمدیؐ کی یہی امتیازی شان ہمارے سامنے رہنی چاہئے جو اس آیت میں بیان ہوئی کہ : ﴿ هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَ دِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّیْنِ كُلِّهٖ ﴾ پورے کے پورے دین (نظامِ اطاعت) پر اس دینِ حق کو غالب و قائم کر دینا یہ ہے بعثتِ محمدیؐ کی غرض و غایت!

دو چشم کشا واقعات

یہ بات بھی سمجھ لیجئے کہ یہ چیز بعثتِ انبیاء کے اساسی مقصد سے جدا نہیں ہے۔ دیکھئے' بعثتِ انبیاء کا اصل مقصد نوعِ انسانی پر اتمامِ حجت ہے۔ اور یہ اسی اتمامِ حجت کا تکمیلی مرحلہ ہے کہ انسان کو اجتماعی نظام کے ضمن میں رہنمائی کے لئے عدل و قسط پر مبنی نظام کا ایک مکمل نمونہ دکھا دیا جائے۔ صرف نظری سطح پر پیش کر دینے سے وہ حجت مکمل نہیں ہو گی' بلکہ اتمامِ حجت کے لئے ضروری ہو گا کہ اس نظام کو بالفعل قائم و نافذ کر کے اور عملاً چلا کر دکھا دیا جائے۔ اس معاملے کی اہمیت کا حوالہ رواں صدی کے دو واقعات کے حوالے سے کیا جا سکتا ہے۔ جب ہندوستان میں پہلی بار مختلف صوبوں میں کانگریس کی حکومتیں بنی تھیں اُس وقت یاد ہو گا کہ گاندھی نے اپنے کانگریسی ساتھیوں اور زعماء کے سامنے ایک عجیب بات کہی تھی' اور وہ یہ کہ "میں اس موقع پر تمہارے سامنے حضرت ابوبکر (رضی اللہ عنہ) اور حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) کی مثال رکھتا ہوں' اس مثال کو ہمیشہ اپنے سامنے رکھو!" غور کیجئے گاندھی نے یہ بات کیوں کہی! اس لئے کہ واقعہ یہ ہے کہ اس عہدِ جدید کے انسان کو جس نوع کے اجتماعی نظام کی ضرورت ہے اس نظام کا ایک کامل نقشہ اور ایک مکمل ماڈل اگر درکار ہے تو اس کی نظیر تاریخ انسانی میں صرف ایک ہی ہے اور وہ ہے دورِ خلافت راشدہ' یعنی وہ نظامِ عدلِ اجتماعی جو قائم فرمایا تھا محمدِ عربی ﷺ نے۔

ایک دوسرا واقعہ جو اس کے دوسرے رُخ پر روشنی ڈال رہا ہے' مولانا عبید اللہ سندھی کے حوالے سے ہے۔ اس واقعے سے دین حق کے قیام و نفاذ کی اہمیت سامنے آتی

ہے۔ مولانا سندھی جب شیخ الہند مولانا محمود الحسن رحمۃ اللہ علیہ کی ریشمی رومالوں کی تحریک کے سلسلے میں ہندوستان چھوڑ کر افغانستان گئے' اور جب افغانستان سے بھی گرفتاری کے خطرے کے پیش نظر سرحد عبور کر کے انہیں روس جانا پڑا تو اُس وقت بالشویک انقلاب ابھی نیا نیا آیا تھا۔ انہوں نے محسوس کیا کہ اس موقع پر انقلاب کے مرکزی رہنماؤں کے سامنے اگر اسلام کا انقلابی پروگرام رکھا جائے تو کیا عجب کہ وہ اس کو قبول کرلیں' ابھی ان میں انقلابی جذبہ بھی ہے اور انقلاب کے نقطۂ نظر سے فضا سازگار بھی ہے۔ چنانچہ اس امید میں انہوں نے لینن سے بات کرنا چاہی' لیکن لینن بستر مرگ پر تھا۔ اس نے کہلا بھیجا کہ ٹراٹسکی سے بات کیجئے' چنانچہ مولانا عبید اللہ سندھی کی ٹراٹسکی سے مفصل گفتگو ہوئی۔ گفتگو کے آخر میں اس نے پوچھا کہ مولانا! یہ نظام جو آپ پیش کر رہے ہیں بظاہر بہت عمدہ معلوم ہوتا ہے' لیکن کیا آپ نے دنیا میں کہیں اسے قائم بھی کیا ہے؟ مولانا عبید اللہ سندھی کہتے ہیں کہ اس کے بعد میری نگاہیں زمین میں گڑی کی گڑی رہ گئیں' دوبارہ میں اس سے آنکھیں چار نہیں کرسکا۔ سیدھی سی بات ہے کہ کوئی نظام حجت تب بنتا ہے جب اسے چلا کر دکھا دیا جائے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس اتمامِ حجت کو اپنے تکمیلی درجے تک پہنچا دیا۔ آپؐ نے جہاں نظری' فکری اور اعتقادی ہدایت دی' انسان کی سوچ کو صحیح رخ پر ڈالا' جہاں آپؐ نے انفرادی اخلاق کے ضمن میں انسان کی سیرت و کردار کی تعمیر کے لئے ایک مکمل ہدایت نامہ عطا فرمایا' خود اپنی سیرت و کردار اور اپنے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی سیرت و کردار کو اس رخ پر ڈھال کر انفرادی اخلاق کے ضمن میں ہمیشہ ہمیش کے لیے نوع انسانی پر حجت تمام کی' وہاں آپؐ نے ایک جاں گسل جدوجہد کے ذریعے تیئس سالہ محنتِ شاقہ کے نتیجے میں اس نظامِ عدل و قسط کو عملاً برپا کر دیا جس میں انفرادی آزادی بھی ہے' لیکن اجتماعیت کے حقوق بھی پورے طور پر محفوظ ہیں' جس میں مساواتِ انسانی بھی ہے' لیکن وہ freedom کی cost پر نہیں کہ مساوات تو ہو لیکن انسان شخصی آزادی سے یکسر محروم کر دیا جائے' بلکہ یہ دونوں اعلیٰ اقدار اس نظام میں بیک وقت موجود ہیں۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ انسان جس اعلیٰ قدر کا تصور کرے گا اسے وہ اس نظام میں موجود پائے گا۔ علامہ اقبال نے اس حقیقت کو بڑے خوبصورت پیرائے میں بیان کیا ہے ؎

ہر کجا بینی جہانِ رنگ و بُو
آنکہ از خاکش بروید آرزو
یا ز نورِ مصطفٰے اُو را بہاست
یا ہنوز اندر تلاشِ مصطفٰے ست

یہ ہے اصل کارنامہ حیاتِ محمدؐ رسول اللہ ﷺ کا جس کو سمجھنے کے لئے حضور ﷺ کے مقصدِ بعثت کی اس امتیازی شان کا فہم ضروری ہے جو اس آیۂ مبارکہ میں وارد ہوئی : ﴿هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّیْنِ كُلِّهٖ﴾

نبی اکرم ﷺ کے مشن کا لازمی تقاضا
جہاد فی سبیل اللہ

سورۃ الصف کے عمود کی تعیین اور اس کی مرکزی آیت کے اکثر حصے پر غور و فکر کر لینے کے بعد اب آیئے کہ ہم اس سورۂ مبارکہ پر بحیثیت مجموعی غور کریں۔ لیکن اس سے قبل اس سورۃ کی مرکزی آیت یعنی آیت نمبر ۹ کے آخری ٹکڑے کے حوالے سے ایک اور عظیم حقیقت کی طرف توجہ کرنا مفید ہو گا۔

آیت کے آخری ٹکڑے کا مفہوم

جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے سورۃ الصف کی وہ مرکزی آیت قرآن مجید میں تین مقامات پر آئی ہے۔ ایک مقام پر اس کا اختتام ﴿وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِیْدًا﴾ کے الفاظ پر ہوتا

ہے۔ اس میں تو گویا اشارہ ہے اسی بات کی طرف جو اس سے پہلے سورۃ الحج کے آخری رکوع کے درس کے ضمن میں عرض کی جا چکی ہے کہ رسول اگر اپنا فرضِ منصبی ادا کر دیں تو گواہی کے لئے اللہ کافی ہے۔ اس حوالے سے سیرتِ طیبہ کا وہ اہم واقعہ ذہن میں تازہ ہو گیا ہو گا کہ حجۃ الوداع کے موقع پر آنحضور ﷺ نے تمام حاضرین سے یہ گواہی لینے کے بعد کہ میں نے حق تبلیغ ادا کر دیا' آسمان کی طرف نگاہ اٹھا کر اللہ تعالیٰ سے بھی عرض کیا : اَللّٰھُمَّ اشْھَدْ' اَللّٰھُمَّ اشْھَدْ! کہ اے اللہ تو بھی گواہ رہ! میرے پاس تیری دو امانتیں پہنچی تھیں' ایک تیری کتاب' جسے میں نے امت تک بلاکم و کاست پہنچا دیا' حق تبلیغ ادا کر دیا' دوسرے دین حق' جسے تیری تائید اور اپنے صحابہ کے تعاون سے میں نے تئیس سالہ محنت شاقہ کے نتیجے میں جزیرہ نمائے عرب پر بالفعل قائم کر دیا۔ اب یہاں تیرا ہی بول بالا ہے' تیرا ہی حکم نافذ ہے اور تیرا ہی جھنڈا سب سے بلند ہے۔ وَکَفٰی بِاللّٰہِ شَھِیْداً۔ اس کی شہادت اور گواہی کے لئے اللہ کافی ہے۔

بقیہ دو مقامات پر یعنی سورۃ التوبہ اور سورۃ الصف میں یہ آیت ﴿ وَلَوْ کَرِہَ الْمُشْرِکُوْنَ ﴾ کے الفاظ پر ختم ہوتی ہے ـــــ "چاہے یہ مشرکوں کو کتنا ہی ناگوار ہو" ـــــ اس میں اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ تصادم ناگزیر ہے۔ مشرک کبھی گوارا نہ کریں گے کہ اللہ کا دین یہاں قائم ہو' وہ نظامِ عدل و قسط عملاً برپا ہو جائے جو محمد رسول اللہ ﷺ لے کر آئے ہیں۔ کفر اور شرک کی قوتیں دین حق کے لئے آسانی سے راستہ نہیں چھوڑیں گی۔ وہ لازماً retaliate کریں گی۔ تصادم ہو کر رہے گا' کشمکش ہو گی' لیکن اس سب کے علی الرغم' اس سب کے باوجود' رسول' کا فرضِ منصبی ہے کہ اس دین کو قائم کرے' اسے غالب و نافذ کرے جو اللہ نے اسے دے کر بھیجا ہے۔

مذہبی اور سیاسی شرک کا گٹھ جوڑ

یہاں ایک بات اور سمجھ لینی چاہئے اور اس کا تعلق ہمارے اس منتخب نصاب میں شرک کی بحث سے جڑ جاتا ہے۔ شرک کے بارے میں یہ خیال بڑا عامیانہ اور سطحی سا ہے کہ اس کا تعلق محض مخصوص مذہبی امور کے ساتھ ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ دنیا میں

تاریخِ نسلِ انسانی کے دَوران ہر دَور میں اور ہر خطۂ زمین میں شرک کے دو نظام ہمیشہ قائم رہے ہیں' ایک مذہبی شرک اور دوسرا سیاسی شرک۔ انہی دو راستوں سے درحقیقت نوعِ انسانی کا استحصال ہوتا چلا آیا ہے۔ مذہبی شرک کی شکل تو یہ ہے کہ کوئی پنڈت' کوئی پروہت' کوئی پادری' کوئی پجاری یا کوئی پیر کسی آستانے کا مجاور بن کر یا کسی بُت کدے کا پروہت یا پجاری بن کر لوگوں کی گردنوں پر سوار ہوتا ہے اور مذہب کے نام پر عوام کے گاڑھے پسینے کی کمائی میں سے نذرانے اور چڑھاوے وصول کرتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ معاشی استحصال (Economic Exploitation) کی انتہائی مکروہ صورت ہے۔ بقولِ شاعر ؏ مانگنے والا گدا ہے صدقہ مانگے یا خراج!

دوسری جانب بادشاہت کے نظام کی صورت میں سیاسی شرک کا نظام تاریخ انسانی کے ہر دَور میں قائم رہا ہے۔ چنانچہ تاریخ کے اوراق پر نظر دوڑائیں تو نظر آتا ہے کہ کہیں یورپ میں Divine Rights of Kings (بادشاہوں کے خدائی اختیارات) کا راگ الاپا جا رہا ہے اور کہیں ہندوستان میں سورج بنسی اور چندر بنسی خاندانوں کی حکمرانی کا سلسلہ رواں ہے۔ یہ بادشاہ اور ملوک اپنے اقتدار و اختیار کے بل پر عوام سے خراج اور نذرانے وصول کرتے تھے۔ اس طرح انسانی تاریخ میں یہ دونوں مشرکانہ نظام ہاتھ میں ہاتھ ڈالے ایک دوسرے سے تعاون کرتے نظر آتے ہیں۔ اِدھر مذہبی طبقات کی طرف سے بادشاہِ وقت کو "His Holiness" کا خطاب مل رہا ہے تو اُدھر سے انہیں "Defenders of the Faith" کے خطاب سے نوازا جا رہا ہے۔ گویا ؏ من ترا حاجی بگویم تو مرا ملّا بگو۔ یہ مذہبی شرک اور سیاسی شرک کے دو نظام جو ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرتے ہوئے ایک دوسرے کے متوازی چلتے رہے اور جنہوں نے انسانوں کی گردنوں پر اپنی خدائی کا جوا ڈالے رکھا' ظاہر بات ہے وہ کبھی گوارا نہیں کر سکتے تھے کہ یہ سارا تانا بانا ٹوٹ کر رہ جائے اور یہ سارے مفادات آنِ واحد میں ختم ہو جائیں۔ علامہ اقبال نے اسی پس منظر میں کہا تھا ؎

میں ناخوش و بیزار ہوں مرمر کی سلوں سے
میرے لئے مٹی کا حرم اور بنا دو!

کیوں خالق و مخلوق میں حائل رہیں پردے
پیرانِ کلیسا کو کلیسا سے اٹھا دو!

اسلام ہے وہ نظام جو اِن درمیانی واسطوں کو ختم کرنے کے لئے آیا ہے' جو یہ پیغام لے کر آیا ہے کہ جہاں چاہو اور جب چاہو خدا سے ہم کلام ہو جاؤ :

﴿ وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ ؕ اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ فَلْیَسْتَجِیْبُوْا لِیْ وَلْیُؤْمِنُوْا بِیْ لَعَلَّهُمْ یَرْشُدُوْنَ ۝ ﴾

(البقرة : ۱۸۶)

"اور (اے نبیؐ) جب میرے بندے آپ سے میرے بارے میں سوال کریں تو (انہیں بتا دیں کہ) میں قریب ہی ہوں' میں ہر پکارنے والے کی پکار (کو سنتا اور اس) کا جواب دیتا ہوں جب بھی وہ مجھے پکارتا ہے' تو چاہئے کہ وہ بھی میرا کہا مانیں اور مجھ پر یقین رکھیں' تاکہ رشد و کامیابی سے ہمکنار ہو سکیں"۔

وہ انسان پر سے انسان کی خدائی کا نام و نشان مٹانا چاہتا ہے۔ ع تمیزِ بندہ و آقا فسادِ آدمیّت ہے۔ یہاں کوئی کسی کا آقا نہیں اور کوئی انسان کسی دوسرے انسان کا بندہ نہیں۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے : ((كُوْنُوْا عِبَادَ اللّٰهِ اِخْوَانًا)) "سب اللہ کے بندے اور آپس میں بھائی بھائی بن جاؤ"۔ تمہارے مابین قوم' نسل اور رنگت کے اعتبار سے کوئی اونچ نیچ نہیں ہے' کوئی تفریق نہیں ہے۔ یہ ہے وہ انقلابی پیغام جو محمد رسول اللہ ﷺ لے کر آئے۔ ان اصولوں پر مبنی نظام کا قیام ظاہر بات ہے کہ اُس مشرکانہ اور باطل نظام کے لئے بہت بڑا چیلنج ہے جہاں اس نظام سے لوگوں کے مفادات وابستہ ہوں۔ اس لئے فرمایا : ﴿ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ﴾ کہ مشرکین کی طرف سے تو مخالفت ہو کر رہے گی۔ وہ کبھی نہیں چاہیں گے کہ یہ نظامِ عدل و قسط دنیا میں قائم اور برپا ہو جائے' انسانوں کی گردنوں پر سے دو طرفہ غلامی کے جوئے اٹھا دیئے جائیں اور ان کی گردنوں میں سے وہ طوق اتار دیئے جائیں جن کے بوجھ تلے نوعِ انسانی ہمیشہ دبی اور سسکتی رہی ہے۔ سورۃ الاعراف میں حضور ﷺ کی یہ شان ان الفاظ میں بیان ہوئی : ﴿ وَیَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِیْ كَانَتْ عَلَیْهِمْ ﴾

آنحضور ﷺ کے مشن کا لازمی تقاضا' جہاد فی سبیل اللہ!

بہرحال اس آخری ٹکڑے یعنی ﴿ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُونَ ﴾ کے ضمن میں اس مختصر سی وضاحت کے بعد اب یہ بات جان لیجئے کہ سورۃ الصف میں حضور ﷺ کے اس مقصد بعثت کی تعیین کے بعد اس کے لازمی تقاضے کی حیثیت سے اب مضمون آ رہا ہے جہاد فی سبیل اللہ کا' کہ اے اہل ایمان! اب اس مشن کی تکمیل کے لئے کمر ہمت کس لو! دین اللہ کا ہے' اس کو غالب کرنا فرضِ منصبی ہے محمد رسول اللہ ﷺ کا۔ تو اب اللہ اور اس کے رسول کے ماننے والوں اور ان پر ایمان کے دعوے داروں کا یہ فرضِ منصبی ہے کہ اس مقصد کے حصول اور اس مشن کی تکمیل کے لئے اپنے آپ کو لگا دیں اور کھپا دیں۔ اس مقصد کے لئے جِدّوجُہد کریں' کوششیں کریں اور اس راہ میں اپنے مال لگائیں' اپنی جانیں کھپائیں' اپنی قوتیں صرف کریں اور اپنے اوقات لگائیں کہ یہ ان کے ایمان کا لازمی تقاضا ہے۔ یہ بات ظاہر ہے کہ اللہ کے دین کو برپا کرنا اور اسے قائم و نافذ کرنا کسی ایک فردِ بشر کا کام نہیں۔ یہ ایک نہایت عظیم کام اور بہت اونچا نصب العین ہے اور اس کے لئے ایک بڑی بھرپور اجتماعی جدوجہد کی ضرورت ہے۔ اس اجتماعی جدوجہد میں نبی ﷺ کے دست و بازو بننا' ان کا ساتھ دینا' ان کی نصرت کرنا اور جہاں اُن کا پسینہ گرا ہو وہاں اپنا خون بہا دینے کو اپنے لئے موجبِ فخر و سعادت جاننا ہر مسلمان کے ایمان کا تقاضا تھا۔ اس لئے کہ جب تک یہ کیفیت اللہ اور رسول ﷺ کے ماننے کے دعوے داروں میں پیدا نہ ہو اس مشن کی تکمیل نہیں ہو سکتی۔ سیرت النبیؐ اور سیرِ صحابہ کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ یہ انقلاب اسی طور سے برپا ہوا ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اپنا تن من دھن سب کچھ اس راہ میں نچھاور کر دیا۔ غزوۂ خندق کا تصور کیجئے جبکہ بڑا ہی کٹھن وقت آن پڑا تھا۔ مدینے کی چھوٹی سی بستی کو بارہ ہزار کا لشکر چاروں طرف سے گھیرے ہوئے تھا اور اُس وقت جبکہ خندق کھودی جا رہی تھی اور پھاوڑے چل رہے تھے' یہ رجز اور یہ ترانہ صحابہؓ کی زبانوں پر تھا : "نَحْنُ الَّذِيْنَ بَايَعُوْا مُحَمَّدًا" کہ ہم ہیں وہ لوگ جنہوں نے بیعت کی ہے محمد ﷺ کے ہاتھ پر۔ "عَلَى الْجِهَادِ مَا بَقِيْنَا اَبَدًا" یہ بیعت ہے جہاد کی کہ جب تک ہم زندہ ہیں اور جب تک جسم و جان کا تعلق برقرار ہے ہم اس جہاد' اس کوشش اور اس

جدّ و جہد میں لگے رہیں گے۔

ایک انتہائی نفع بخش تجارت!

چنانچہ سورۃ الصف کی اس مرکزی آیت کے بعد اگلی ہی آیت میں مسلمانوں سے یہ سوال کیا گیا : ﴿ یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰی تِجَارَةٍ ﴾ کہ اے اہلِ ایمان! کیا میں تمہاری رہنمائی کروں اس کاروبار کی طرف' اس تجارت کی طرف جو تمہیں نجات دے ایک دردناک عذاب سے؟ ـــــ یہ انسانی ذہن کے بہت قریب آکر بات کرنے کا انداز ہے کہ تم دُنیوی کاروبار اور اس سے حاصل ہونے والے نفع کو خوب جانتے ہو' لیکن ایک کاروبار وہ بھی ہے کہ جس سے حاصل ہونے والا نفع عذابِ الیم سے چھٹکارے کی صورت میں ظاہر ہو گا۔ اس کاروبار کے نتیجے میں تم دردناک عذاب سے بچ جاؤ گے' جہنم کی آگ سے تمہیں رستگاری حاصل ہو جائے گی۔ یہ سوال کرنے کے بعد جواب بھی اللہ تعالیٰ نے خود دیا۔ تعلیم و تفہیم کا یہ بڑا ہی حکیمانہ انداز ہے کہ سوال کیا جائے اور پھر اس کا جواب دیا جائے۔

فرمایا : ﴿ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ﴾ "تم ایمان پختہ رکھو اللہ پر اور اُسکے رسولؐ پر"۔ یہ مقام بھی ان مقامات میں سے ہے جہاں یہ بات وضاحت سے سامنے آتی ہے کہ قانونی ایمان کچھ اور شے ہے اور حقیقی ایمان کچھ اور! خطاب اُن سے ہو رہا ہے جو پہلے سے مسلمان ہیں۔ ﴿ یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ﴾ کے الفاظ پر غور کیجئے! کہ اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو! جو ایمان کا دعویٰ اور اس کا اعلان کر رہے ہو! اور اِقْرَارٌ بِاللِّسَانِ کا مرحلہ طے کر چکے ہو! تم اگر یہ چاہتے ہو کہ تمہیں فی الواقع عذابِ الیم سے چھٹکارا ملے تو اس کا راستہ ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ اللہ اور اس کے رسولؐ پر یقین محکم رکھو : ﴿ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ﴾ اور ﴿ وَتُجَاهِدُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ ﴾ "جہاد کرو اللہ کی راہ میں! کھپاؤ اُس میں اپنی جانیں بھی اور اپنے مال بھی"۔ دیکھئے "فی سبیل اللہ" کا تعین پچھلی آیت میں کیا جا چکا ہے کہ اللہ کے دین کو غالب کرنے اور اس نظامِ عدل و قسط کو قائم کرنے کے لئے جو محمد رسول اللہ ﷺ دے کر مبعوث کئے گئے ہیں' تمہیں اپنی جان

اور اپنے مال کو لگانا اور کھپانا ہے۔ دین کو قائم و غالب کرنا اگرچہ اصلاً فرضِ منصبی ہے نبی اکرم ﷺ کا، لیکن اس کے غلبے کی جِدّوجُہد میں تمہیں اپنی جانوں کا ہدیہ پیش کرنا ہے اور اپنے خون سے اس انقلاب کی آبیاری کرنی ہے۔ تمہیں اس کی بنیادوں میں اپنی ہڈیوں اور خون کا گارا بھرنا ہوگا! یہ کام اسی طور سے ہوگا اور اسی میں درحقیقت تمہارے ایمان کا امتحان ہے۔ یہ دلیل ہوگی اس بات کی کہ واقعتاً ایمان تمہارے دلوں میں اتر گیا ہے۔

اس آیت میں گویا اسی مضمون کا اعادہ ہو گیا جو ہم سورۃ الحجرات میں پڑھ آئے ہیں کہ : ﴿ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا وَجٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ۝ ﴾ کہ اپنے دعویٰ ایمان میں صرف وہی لوگ سچے ہیں جو ان دو شرائط کو پورا کریں : (i) یقینِ قلبی کی یہ صورت کہ اللہ اور اس کے رسولؐ پر ان کا ایمان یقین کی شکل اختیار کر کے دل کے اندر جاگزیں ہو چکا ہو، اور (ii) اس یقین کا عملی مظہر ہو گا جہاد فی سبیل اللہ، اللہ کے دین کے غلبے اور اس کے کلمے کی سربلندی کے لئے جان اور مال کا کھپانا۔ یہ ہے گویا کہ سورۃ الصف کا مرکزی مضمون جو آیت نمبر۹ اور نمبر۱۰ کے حوالے سے معین ہو گیا۔

اب ہمیں اس سورۂ مبارکہ کا ابتداء سے مطالعہ کرتے ہوئے اس کے تین حصوں اور ان میں شامل آیات کے باہمی ربط اور بالخصوص اس سورۃ کے مرکزی مضمون کے ساتھ ان کے ربط و تعلق کو سمجھنا ہے۔ مرکزی مضمون کی تعیین کے بعد بقیہ آیات کو سمجھنا ان شاء اللہ بہت آسان ہو گا۔

قول و فعل کے تضاد پر اللہ کا غضب

اس سورۂ مبارکہ کا پہلا حصہ چار آیات پر مشتمل ہے :

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

﴿ سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴾

"آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے اللہ کی تسبیح میں مشغول ہے، اور وہ زبردست ہے کمال حکمت والا ہے"۔

یہ ایک بڑا ہی پُرشکوہ آغازِ کلام ہے۔ جانتے ہو کون تم سے مخاطب ہے؟ وہ جو خالقِ ارض و

سماء ہے، جس کی تسبیح و تحمید میں اس کائنات کا ذرہ ذرہ لگا ہوا ہے۔ وہ العزیز ہے، زبردست ہے، کمال حکمت والا ہے۔

اگلی آیت میں زجر اور ڈانٹ کا انداز ہے، مسلمانوں کو جھنجھوڑا جا رہا ہے :

﴿ یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ۝ ﴾

"اے اہلِ ایمان! کیوں کہتے ہو جو کرتے نہیں!"

تمہارے قول اور فعل کا یہ تضاد اللہ کے نزدیک انتہائی ناپسندیدہ ہے۔ اگلے الفاظ بہت سخت ہیں :

﴿ کَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ۝ ﴾

"اللہ کے نزدیک یہ بات انتہائی بیزار کن ہے کہ تم کہو وہ کچھ جو کرتے نہیں ہو"۔

"مقت" عربی زبان میں غیظ اور غصے سے بھی آگے کی کیفیت کے لئے آتا ہے۔ اگر کوئی شخص کسی وقت آپ کی توقعات پر پورا نہ اُترے تو آپ کو غصہ آتا ہے، لیکن ایک مرحلہ وہ آتا ہے کہ توقع بالکل ختم ہو جاتی ہے اور ایک بیزاری کی سی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ "مقت" کا لفظ درحقیقت اسی کیفیت کا غماز ہے۔[1] یہ گویا انتہائی ملامت کا انداز ہے کہ تمہاری یہ لن ترانیاں، تمہارے محبت خداوندی اور عشق رسولؐ کے یہ دعوے تمہارے عمل سے مطابقت نہیں رکھتے۔ دعوے اتنے بلند آہنگ ہوں اور عمل اس معیار پر پورا نہ اتر رہا ہو، اللہ کے ساتھ وفاداریاں اور رسولؐ کی فرماں برداری نہ ہو رہی ہو، اللہ اور رسولؐ اور ان کے دین کے لئے حمیت اور غیرت موجود نہ ہو، دین حق کو پامال دیکھو اور اپنے دھندوں میں لگے رہو، اسے مغلوب پاؤ اور پھر بھی دنیا کمانے میں مصروف و مشغول رہو، یہ قول و فعل کا وہ تضاد ہے جو اللہ کے نزدیک انتہائی قابل مذمت اور بیزار کن ہے۔ ﴿ کَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ۝ ﴾ ایمان لائے ہو تو اس کے تقاضوں کو پورا کرنا ہو گا، خدا کو مانا ہے تو اس کے دین کے لئے جان اور مال کھپانے

---

[1] عرب میں ایک مکروہ رواج یہ تھا کہ باپ کے مرنے کے بعد اس کے بیٹے اپنی سوتیلی ماؤں سے نکاح کر لیتے تھے۔ تاہم ایسے نکاح کو اس معاشرے میں انتہائی ناپسندیدہ خیال کیا جاتا تھا اور اس کے لئے "نکاحِ مقت" کی اصطلاح مستعمل تھی۔

ہوں گے، محمدؐ رسول اللہ ﷺ سے محبت ہے تو آپؐ کے مشن کی تکمیل کے لئے اپنی جانیں اور اپنے مال صرف کرنے ہوں گے۔ یا چناں کن یا چنیں! یا اس دعوے سے دستبردار ہو جاؤ، یا دعویٰ کرتے ہو تو اس کو عملاً پورا کرو! اقبال نے غالباً اسی لئے کہا تھا ؎

چو می گویم مسلمانم بلرزم
کہ دانم مشکلاتِ لا اِلٰہ را

اور ؎

یہ شہادت گہِ الفت میں قدم رکھنا ہے
لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلماں ہونا

محبت مجھے اُن جوانوں سے ہے...

چوتھی آیت میں یہ مضمون اپنے نقطۂ عروج کو پہنچ گیا۔ فرمایا :

﴿ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِهٖ صَفًّا كَاَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ ۝ ﴾

"اللہ کو تو محبت اُن سے ہے[1] جو جنگ کرتے ہیں اُس کی راہ میں صفیں باندھ کر، ایسے گویا کہ سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہوں"۔

یہاں جہاد فی سبیل اللہ کے بلند ترین مقام یعنی قتال فی سبیل اللہ کا ذکر ہے۔ جہاد ایک وسیع اصطلاح ہے۔ دین کے لئے جِدّوجُہد، محنت، کوشش اور دعوت و تبلیغ، سب جہاد ہی کی صورتیں ہیں۔ اسی طرح دین کی نشر و اشاعت کے لئے محنت کرنا، لوگوں سے گفتگو کر کے انہیں ہم خیال بنانے کی ہر ممکن صورت کا اختیار کرنا، پھر جو لوگ اس دعوت کو قبول کریں انہیں منظم کرنا اور ان کی مناسب تربیت کا اہتمام کرنا، یہ تمام کام جہاد فی سبیل اللہ میں شامل ہیں، لیکن اس تصادم اور کشمکش کا آخری مرحلہ اور اس کا نقطۂ عروج ہے قتال فی سبیل اللہ! ـــــ یہاں اس کا ذکر کیا گیا تاکہ معلوم ہو جائے کہ جیسے

---

[1] غالباً علامہ اقبال نے اپنے اس شعر کا اسلوبِ بیان اسی آیت مبارکہ سے اخذ کیا تھا کہ ؎

محبت مجھے ان جوانوں سے ہے ستاروں پہ جو ڈالتے ہیں کمند!

راستہ جا کدھر رہا ہے! جہاد فی سبیل اللہ کے جس راستے پر تم نے قدم دھرے ہیں اس کی آخری منزل کونسی ہے! چنانچہ فرمایا : ﴿ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِهٖ صَفًّا كَاَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ ۝ ﴾ قدم اس طرح سے جمے ہوئے ہوں اور صف بندی ایسی مضبوط ہو کہ جیسے کوئی سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہو کہ نہ اسے اپنی جگہ سے ہٹایا جا سکے' نہ اس میں کہیں کوئی رخنہ پیدا کیا جا سکے۔

اسلام میں "خیر اعلیٰ" کا تصور

اس آیت کا حوالہ ہمارے منتخب نصاب کے بالکل آغاز میں آیۂ بر کے ضمن میں آیا تھا کہ ہر نظامِ فکر کے نظریۂ اخلاق میں کسی نہ کسی خیر اعلیٰ (Summum Bonum) یا بالفاظ دیگر کسی Highest Virtue کا تصور موجود ہوتا ہے کہ سب سے اعلیٰ قدر کونسی ہے' نیکی کی بلند ترین منزل کون سی ہے۔ نوٹ کیجئے کہ آیۂ بر کے اختتام پر جو مضمون آیا تھا اسی کا اعادہ سورۃ الصف کی اس آیت میں ہوا ہے۔ وہاں نیکی کی بحث کا اختتام ان الفاظ پر ہوا تھا : ﴿ وَالصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ ﴾ اور صبر کرنے والے' ڈٹ جانے والے' برداشت اور تحمل کا مظاہرہ کرنے والے فقر و فاقہ میں' تکلیف و اذیت میں اور میدان جنگ میں ـــــ گویا اسلام کے نظامِ فکر اور اس کے نظریۂ اخلاق میں بلند ترین نیکی یا خیر اعلیٰ (Summum Bonum) کا جو تصور ہے وہ اللہ کی راہ میں اپنی جان دے دینا ہے۔

بہرحال یہ پہلی چار آیات تمہید بن رہی ہیں اس مطالبۂ جہاد و قتال کی جو آگے آ رہا ہے۔ اگلی آیات میں بعثتِ نبوی (علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) کے مقصد اور مشن کی تکمیل کے لئے مسلمانوں کو عمل کی دعوت دی جاتی ہے' لہٰذا آغاز میں تمہید کے طور پر یہ انداز اختیار کیا گیا ہے کہ جان لو کہ صرف زبانی اقرارِ ایمان تمہیں اللہ کے ہاں اُن وعدوں کا مستحق نہیں بنائے گا جو اُس نے اپنے مؤمن بندوں سے کئے ہیں' بلکہ قولی اقرار کے ساتھ ساتھ عمل کی گواہی بھی ضروری ہے' اور اس عمل کی چوٹی ہے قتال فی سبیل اللہ' جو بندۂ مؤمن کی عملی جدوجہد کا نقطۂ عروج ہے۔

نبی اکرم ﷺ کا ارشاد ہے کہ جس شخص کی موت واقع ہوئی اس حال میں کہ اس کے دل میں شہادت کی تمنا نہ ہو' اس کی موت ایک نوع کے نفاق پر واقع ہوئی۔ یہ درحقیقت ایمان کا منطقی اور لازمی نتیجہ ہے۔ عین ممکن ہے کہ انسان کی ساری زندگی اللہ کی راہ میں مجاہدے اور جدوجہد میں گزرے' لیکن قتال کا مرحلہ نہ آئے۔ تاہم ایک بندۂ مؤمن کے سینے کو اس آرزو سے آباد رہنا چاہئے کہ کاش کہ وہ وقت آئے کہ اپنی جان کا ہدیہ اللہ کے حضور میں پیش کر کے وہ سرخرو ہو جائے' سبکدوش ہو جائے۔ سورۃ الاحزاب میں اہل ایمان کی شان میں یہ الفاظ آئے ہیں : ﴿ فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ ﴾ کہ ان صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں بہت سے وہ ہیں جو اپنی نذر پیش کر چکے' راہِ حق میں گردنیں کٹوا کر سبکدوش ہو چکے اور باقی منتظر ہیں کہ کب ہماری باری آئے اور ہم بھی اس امتحان میں سرخرو ہو جائیں!

یہود کا ذکر بطور نشانِ عبرت

اگلی چار آیات میں یہود کی تاریخ کے حوالے سے مسلمانوں کو متنبہ کیا گیا ہے ـــــ اور یہ ان "مُسَبِّحَات" کے مشترک امور میں سے ہے کہ ان میں جابجا بنی اسرائیل کو بطور نشانِ عبرت پیش کیا گیا ہے ـــــ کہ اے مسلمانو! قول و عمل کا تضاد اور ایمان کے عملی تقاضوں کی ادائیگی سے پہلوتہی' یہی وہ اصل جرم تھا کہ جس کی پاداش میں یہود اس مقام اور منصب سے معزول کر دیئے گئے جس پر آج تم فائز کئے گئے ہو۔ چار آیات میں یہود کی تاریخ کے تین ادوار کا ذکر ہے۔ فرمایا :

﴿ وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ لِمَ تُؤْذُوْنَنِيْ وَقَدْ تَّعْلَمُوْنَ اَنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ ؕ فَلَمَّا زَاغُوْٓا اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ۝ ﴾

"اور یاد کرو جب کہا تھا موسیٰ (علیہ السلام) نے اپنی قوم سے کہ اے میری قوم کے لوگو! کیوں مجھے ایذا پہنچاتے ہو درانحالیکہ تم خوب جان چکے ہو کہ میں اللہ کا رسول ہوں تمہاری طرف۔ پھر جب وہ ٹیڑھے ہو گئے تو اللہ نے ان کے دلوں کو بھی کج کر دیا' اور اللہ ایسے فاسقوں کو ہدایت نہیں دیتا۔"

قوم کے جہاد سے انکار پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بیزاری

اس آیۂ مبارکہ پر پہلے تو اس اعتبار سے غور کیجئے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اپنی امت کے ہاتھوں کس نوعیت کے دکھ سہنے پڑے ہوں گے! یقیناً کوئی نہ کوئی ذاتی اذیت بھی آپ کو پہنچائی گئی ہو گی' جیسے کہ خود نبی اکرم ﷺ کو اُن لوگوں کی زبان سے جو بظاہر کلمہ گو لیکن حقیقت کے اعتبار سے منافق تھے' انتہائی اذیت پہنچتی رہی' یہاں تک کہ اُم المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا پر تہمت لگی۔ ہم تصور نہیں کر سکتے کہ کتنی کوفت اور کتنی ذہنی و قلبی اذیت محمد رسول اللہ ﷺ کو اس واقعے سے پہنچی ہو گی۔ تو جیسا کہ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نوع کی کچھ اذیتیں بھی یہود کے ہاتھوں حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کو پہنچی ہوں تو یہ کوئی بعید از قیاس بات نہیں ہے' لیکن "اَلْقُرْاٰنُ یُفَسِّرُ بَعْضُهٗ بَعْضًا" کے اصول کے تحت تلاش کیجئے کہ حضرت موسیٰؑ کو قوم کے ہاتھوں اصل اذیت کب پہنچی تھی تو آپ کو سورۃ المائدۃ میں اس کی تفصیل ملے گی کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم بنی اسرائیل کو مصر کی غلامی کے پھندوں سے نجات دلا کر لائے اور صحرائے سینا میں پڑاؤ کیا جہاں انہیں "تورات" عطا کی گئی' تو بالآخر جہاد و قتال کا مرحلہ سامنے آیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے قوم کو حکم دیا کہ اب اس ارضِ مقدس یعنی فلسطین میں داخل ہو جاؤ' قتال فی سبیل اللہ کے لئے کمر ہمت کس لو تو قوم نے صاف جواب دے دیا : ﴿ اِذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَآ اِنَّا هٰهُنَا قَاعِدُوْنَ ﴾ کہ "اے موسیٰ جاؤ تم اور تمہارا رب' تم دونوں قتال کرو' ہم تو یہاں بیٹھے ہیں!" ہم اپنی گردنیں کٹوانے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ اس پر رنج و صدمے کی جو کیفیت حضرت موسیٰ علیہ السلام پر طاری ہوئی اس کا نقشہ قرآن مجید نے کھینچا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم سے حد درجہ مایوسی اور بیزاری کا اظہار کرتے ہوئے بارگاہِ خداوندی میں عرض کرتے ہیں : ﴿ رَبِّ اِنِّیْ لَآ اَمْلِكُ اِلَّا نَفْسِیْ وَاَخِیْ ﴾ "اے پروردگار! مجھے خود اپنی اور اپنے بھائی کی جان کے سوا کسی پر کوئی اختیار حاصل نہیں" ﴿ فَافْرُقْ بَیْنَنَا وَبَیْنَ الْقَوْمِ الْفٰسِقِیْنَ ۝ ﴾ (المائدۃ : ۲۴-۲۶) "تو اے پروردگار! اب ہمارے اور فاسقوں کی اس قوم کے درمیان تفریق کر دے" (میں ان کے ساتھ مزید رہنے کے لئے تیار نہیں) ـــــ یہ گویا وہ سب سے بڑی اذیت تھی جو اپنی امت کے ہاتھوں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جھیلنی پڑی۔

اللہ تعالیٰ کے قانونِ ہدایت وضلالت کی ایک اہم دفعہ

سورۃ الصف کی آیت نمبر ۵ ﴿ وَاِذْ قَالَ مُوْسٰی لِقَوْمِهٖ.... ﴾ جس سلسلۂ کلام اور جس ربط کے ساتھ اس سورۂ مبارکہ میں وارد ہوئی ہے' اس کے مطابق اس کا اصل مفہوم واضح ہو گیا۔ لیکن جیسا کہ بارہا عرض کیا گیا ہے' یہ بات پیش نظر رہے کہ قرآن مجید کی ہر آیت اپنی جگہ علم و حکمت کا ایک مکمل موتی ہے۔ اسے جب ایک سلسلۂ مضمون کی کڑی میں پرو دیا جاتا ہے تو اس کا ایک مفہوم اور ایک رُخ متعین ہو جاتا ہے' لیکن اس کا کوئی دوسرا رُخ بھی ہو سکتا ہے جو اس سلسلۂ کلام کے اعتبار سے اگرچہ ضمنی قرار پائے گا لیکن اس کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہو گی۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ قرآن حکیم کے علوم و معارف کے بہت سے قیمتی موتی اسی طرح آیات کے ضمنی مضامین کی حیثیت سے وارد ہوئے ہیں۔

یہاں ﴿ فَلَمَّا زَاغُوْٓا اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ ﴾ (پھر جب وہ ٹیڑھے ہو گئے تو اللہ نے ان کے دلوں کو بھی کج کر دیا) کے الفاظ میں اللہ تعالیٰ کے قانونِ ہدایت وضلالت کی ایک بہت اہم دفعہ بیان ہو رہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسان کو ہدایت یا ضلالت میں سے کسی ایک کو اپنانے کا اختیار (choice) دیا گیا ہے۔ جیسا کہ سورۃ الدھر میں فرمایا گیا : ﴿ اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا ﴾ (خواہ وہ شکر والا بنے خواہ کفر کرنے والا) چاہے اِدھر آ جائے' چاہے اُدھر چلا جائے۔ انسان اگر ہدایت کی راہ اختیار کرے گا تو اللہ تعالیٰ اسے اس کے لئے کھولتا چلا جائے گا' آسان کرتا چلا جائے گا' اور اگر وہ کج روی اختیار کرے گا تو وہی راستہ اس کے لئے آسان کر دیا جائے گا اور پھر اس پر وہ بڑھتا چلا جائے گا۔ اور جب انسان غلط راستے پر پڑ جائے اور پھر اس پر بڑھتا چلا جائے تو ایک وقت ایسا آتا ہے جسے ہم انگریزی میں "Point of no return" سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ گویا آدمی اس درجے آگے نکل گیا کہ اب واپسی کا امکان ہی نہیں۔ اس مرحلے کو قرآن حکیم ان الفاظ سے تعبیر کرتا ہے :

﴿ خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ وَعَلٰٓى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ ﴾

"اللہ نے اُن کے دلوں پر اور اُن کی سماعت پر مہر لگا دی ہے اور اُن کی آنکھوں پر پردے ڈال دیئے ہیں"۔

اسی کیفیت کے لئے یہاں "اَزَاغَ اللّٰہُ قُلُوْبَھُمْ" کے الفاظ لائے گئے ہیں۔ یعنی جب انہوں نے کج روی اختیار کی تو اللہ نے اُن کے دلوں کو بھی ٹیڑھا کر دیا۔ اس لئے کہ اللہ کا یہ ضابطہ اور قانون ہے کہ وہ کسی کو بالجبر ہدایت کی راہ پر نہیں لانا چاہتا۔ چنانچہ آیت کے اختتام پر فرمادیا گیا: ﴿ وَاللّٰہُ لَا یَھْدِی الْقَوْمَ الْفٰسِقِیْنَ ۝ ﴾ یعنی اللہ ان لوگوں کو جو فسق وفجور ہی کی راہ اختیار کرلیں، جو کج روی کو پسند کرلیں، زبردستی ہدایت نہیں دیا کرتا۔

مذکورہ بالا آیۂ مبارکہ میں تاریخ بنی اسرائیل کے ایک دَور کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے، جب اللہ کے رسول حضرت موسیٰ علیہ السلام ان کے مابین موجود تھے اور اس کے باوجود ان کا طرزِ عمل یہ تھا۔ تورات میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا یہ قول نقل ہوا ہے کہ بنی اسرائیل سے خطاب کرکے انہوں نے فرمایا: "اے قوم! تُو تو اس چھنال کی مانند ہے کہ جو پہلی شب میں بے وفائی کی مرتکب ہوئی ہو!"

حضرت مسیح علیہ السلام کی بعثت اور یہود کا معاندانہ رویّہ

اگلی آیت میں بنی اسرائیل کی تاریخ کی ایک جھلک دکھائی جارہی ہے۔ یہ قوم اپنی اس کج روی میں اس حد تک بڑھ گئی کہ جب سلسلۂ بنی اسرائیل کے خاتم الانبیاء اور آخر الرُّسل حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بعثت ہوئی تو آپ کے ساتھ بھی ان کا طرزِ عمل انتہائی معاندانہ رہا۔

﴿ وَاِذْ قَالَ عِیْسَی ابْنُ مَرْیَمَ یٰبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ اِلَیْکُمْ مُّصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیَّ مِنَ التَّوْرٰىۃِ وَمُبَشِّرًا بِرَسُوْلٍ یَّاْتِیْ مِنْۢ بَعْدِی اسْمُہٗٓ اَحْمَدُ ؕ فَلَمَّا جَآءَھُمْ بِالْبَیِّنٰتِ قَالُوْا ھٰذَا سِحْرٌ مُّبِیْنٌ ۝ ﴾

"اور جب کہا عیسیٰ ابن مریم نے کہ اے اولادِ یعقوب! میں تمہاری طرف اللہ کا فرستادہ ہوں، میں تصدیق کرتے ہوئے آیا ہوں اس کی کہ جو میرے سامنے موجود ہے تورات میں سے اور بشارت دیتے ہوئے آیا ہوں ایک رسول کی جو میرے بعد آئیں گے جن کا نام ہے احمد (مجتبیٰ ﷺ)۔ پھر جب وہ ان کے پاس صریح

نشانیوں کے ساتھ آئے تو انہوں نے کہا کہ یہ تو کھلا جادو ہے"۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کے پاس ایسی کھلی کھلی نشانیاں اور معجزات لے کر آئے تھے جو پہلے کسی کو نہ دیئے گئے تھے۔ حتیٰ معجزات میں مُردوں کو زندہ کر دینے اور مٹی سے پرندوں کی تخلیق سے بڑھ کر کسی معجزے کا تصور نہیں کیا جا سکتا' لیکن علمائے یہود اور ان کے بڑے بڑے اصحابِ علم و فضل کی گراوٹ' ان کی پستی اور حق سے ان کے بُعد کا عالم یہ ہو گیا کہ ایسے صریح معجزے دیکھ کر بھی ان بدبختوں نے کہا کہ یہ تو کھلا جادو ہے' اور چونکہ جادو کفر ہے' لہٰذا یہ مرتد ہے' اور واجب القتل ہے۔ تو بنی اسرائیل نے اللہ کے ایک جلیل القدر پیغمبر کے ساتھ یہ طرزِ عمل اختیار کیا۔ یہ گویا کہ تاریخ بنی اسرائیل کا دوسرا دور ہے۔

اس آیۂ مبارکہ میں بھی ایک مضمون جو اس سورت کے سلسلۂ کلام کی نسبت سے تو اگرچہ ضمنی کہلائے گا' لیکن اپنی جگہ پر بہت اہم ہے' یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بعثت ایک عجیب شان کی حامل ہے۔ وہ کوئی نئی شریعت لے کر نہیں آئے' بلکہ شریعتِ موسوی ہی کی تجدید کیلئے آئے تھے۔ متی کی انجیل میں "Sermon of the Mount" میں ان کا یہ جملہ موجود ہے :

"Don't think I have come to destroy law"

یعنی "کبھی یہ نہ سمجھنا کہ میں شریعت کو ختم کرنے آیا ہوں"۔ آپ شریعت کو ختم کرنے کے لئے نہیں' بلکہ شریعت کو قائم کرنے کے لئے آئے تھے۔ ان کی ایک حیثیت ہے شریعتِ موسوی کے مجدّد کی ایک اور حیثیت ہے محمد رسول اللہ ﷺ کے پیشرو اور آپؐ کے بارے میں بشارت و خوشخبری دینے والی کی۔ چنانچہ ﴿ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَمُبَشِّرًا بِرَسُوْلٍ يَّاْتِيْ مِنْۢ بَعْدِي اسْمُهٗٓ اَحْمَدُ ﴾ کے الفاظ مبارکہ میں بعثتِ عیسوی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے دو پہلو بھی بیان ہو گئے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ بنی اسرائیل کی جو روش رہی اس کو واضح کرنے کے بعد فرمایا :

﴿ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَهُوَ يُدْعٰٓى اِلَى

الْاِسْلَامِ ﴾

"اور اُس شخص سے بڑھ کر ظالم اور کون ہو گا جو اللہ پر جھوٹ تراشے' جبکہ اسے اسلام کی طرف پکارا جا رہا ہو"۔

یہ آیت کچھ برزخی مزاج کی ہے۔ اس کا تعلق آیۂ ماسبق سے بھی جُڑ جاتا ہے اور آیۂ مابعد سے بھی۔ اس میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دَور میں یہود کے طرزِ عمل کی طرف اشارہ بھی موجود ہے اور بعثتِ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے بعد محمد رسول اللہ ﷺ کے ساتھ جو اُن کا سلوک رہا' وہ بھی اس کے آئینے میں دیکھا جا سکتا ہے۔ فرمایا گیا کہ ان سے بڑھ کر ظالم اور کون ہو گا جو اللہ کی طرف جھوٹ منسوب کریں' جبکہ انہیں اسلام کی طرف پکارا جا رہا ہو' اسلام کی دعوت دی جا رہی ہو! حضرت مسیح علیہ السلام بھی دعوتِ اسلام لے کر آئے تھے اور محمد رسول اللہ ﷺ بھی دعوتِ اسلام لے کر آئے۔ آیت کے آخر میں فرمایا :

﴿ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۝ ﴾

"اور اللہ ایسے ظالموں کو ہدایت نہیں دیتا"۔

ربطِ کلام کو ذہن میں رکھ کر غور کیجئے کہ قول اور فعل کے تضاد سے کوئی اُمّتِ مُسلمہ پستی کی کس حد تک پہنچ سکتی ہے! اس کے لئے ایک نشانِ عبرت کے طور پر تاریخِ بنی اسرائیل کے یہ اَدوار سامنے لائے جا رہے ہیں۔

ع نورِ خدا ہے کفر کی حرکت پہ خندہ زن

اس کے بعد آتی ہے وہ آیت جس میں یہود کے اس طرزِ عمل کا ذکر ہے جو انہوں نے محمد رسول اللہ ﷺ کے ساتھ اختیار کیا' اور جس کی طرف اشارہ اس سے پہلی آیت میں موجود ہے۔ یہود کی بدبختی اور بدنصیبی ملاحظہ ہو کہ وہ خود منتظر تھے آخری نبی کی بعثت کے' اور ان سے یہ توقع تھی کہ وہ بڑھ کر آپ کا استقبال کریں گے۔ ان کے کچھ قبیلے آ کر عرب میں آباد ہی اس لئے ہوئے کہ ان کی کتابوں میں یہ خبر تھی کہ کھجوروں کی سرزمین میں آخری نبی کا ظہور ہو گا۔ چنانچہ اس امید میں کہ ہم اس کا وقت پالیں اور اس کے ساتھی

بن سکیں' ان کے کچھ قبیلے یہاں آکر آباد ہوئے' اور وہ اوس و خزرج کے لوگوں کو دھمکایا کرتے تھے کہ اس وقت تو تم ہم پر غالب ہو' ہمیں دبالو جتنا چاہو' لیکن ایک وقت آنے والا ہے اور وہ دُور نہیں کہ نبی آخرالزّمان کا ظہور ہونے والا ہے اور جب ہم ان کے ساتھ ہو کر تم سے جنگ کریں گے تو تم ہم پر غالب نہ آسکو گے۔ لیکن یہود کی کہی ہوئی اسی بات کی وجہ سے اوس اور خزرج کے لوگ ایمان میں پیش قدمی کر گئے۔

بیعتِ عقبۂ اُولیٰ کے موقع پر رسول اللہ ﷺ نے حج کے لئے آئے ہوئے مدینہ کے چھ افراد کے سامنے دعوت پیش کی تو انہوں نے کنکھیوں سے ایک دوسرے کو دیکھا اور آپس میں سرگوشی کی کہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ وہی رسول ہیں جن کا یہود حوالہ دیا کرتے ہیں اور جن کا ذکر کیا کرتے ہیں' اور آؤ اس سے پہلے کہ یہود پیش قدمی کریں' ہم ان پر سبقت کریں اور ایمان لے آئیں۔ تو اللہ نے انہیں ایمان کی دولت سے سرفراز فرمادیا اور یہود اس نعمت سے محروم رہے' اور نہ صرف محروم رہے بلکہ یہ قوم نبی اکرم ﷺ کی مخالفت میں ہمیشہ پیش پیش رہی اور آپ کے خلاف سازشوں اور ریشہ دوانیوں میں کھلے کھلے کافروں اور مشرکوں کو مات کر گئی۔ یہاں قرآن نے ان پر ایک تعریض کے انداز میں ان کی جو اصل صورت حال تھی' اس کا نقشہ ان عجیب الفاظ میں کھینچا ہے :

﴿ يُرِيْدُوْنَ لِيُطْفِئُوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ ﴾

"یہ چاہتے ہیں کہ اللہ کے نور کو اپنے مُنہ کی پھونکوں سے بجھادیں"۔

مولانا ظفر علی خاں نے دراصل یہیں سے اپنے اس شعر کے لئے خیال اخذ کیا ہے :

نورِ خدا ہے کفر کی حرکت پہ خندہ زن
پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا!

﴿ يُرِيْدُوْنَ لِيُطْفِئُوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ ﴾ کے الفاظ میں خاص طور پر اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہود کبھی بھی کھلے میدان میں حضور ﷺ کا مقابلہ نہ کرسکے۔ ابوجہل مقابلے پر آیا تو مرنے اور مارنے کے لئے آیا اور اس نے اپنی گردن کٹالی۔ لیکن یہود میں یہ حوصلہ نہ تھا۔ قرآن مجید میں ایک دوسرے مقام پر یہ بات فرمائی گئی ہے کہ اے نبی! یہ یہودی کبھی آپ کے ساتھ کھلے میدان میں مقابلے پر نہ آئیں گے۔ ان کا سارا معاملہ کہیں

دیواروں کے پیچھے سے اپنا تحفظ لے کر' کہیں چھتوں کے اوپر سے پتھر برسا کر یا دوسروں کو اُبھار کر اور اشتعال دلا کر آپ کے خلاف اکسانے کی طرح کا ہی ہو گا۔ یہاں اسی کی طرف تعریض کے انداز میں اشارہ کیا گیا ہے کہ یہ اللہ کے نور کو اپنے مُنہ کی پھونکوں سے بجھا دینا چاہتے ہیں۔

﴿ وَاللّٰهُ مُتِمُّ نُوْرِهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ ۝ ﴾

"اور اللہ تو اپنے نور کا اتمام کر کے رہے گا' اگرچہ یہ کافروں کو کیسا ہی ناگوار گزرے"۔

اللہ کا یہ اٹل فیصلہ ہے اور تاریخ نسل انسانی کا وہ وقت آچکا ہے کہ اس نور کا اتمام کر دیا جائے' اس ہدایت کی تکمیل ہو جائے' وہ وقت آ جائے جبکہ اعلانِ عام ہو کہ ﴿ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا ﴾ اور اللہ کا یہ اٹل فیصلہ پورا ہو کر رہے گا۔ بعثت محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام حکمت خداوندی کے اسی تقاضے کے تحت ہوئی ہے۔

نبی اکرم ﷺ کا مقصد بعثت

﴿ هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ﴾

"وہی ہے (اللہ) جس نے بھیجا اپنے رسول (محمد ﷺ) کو الہدیٰ اور دینِ حق کے ساتھ' تاکہ وہ غالب کر دے اس کو کُل کے کُل دین پر' خواہ مشرکوں کو یہ کتنا ہی ناگوار گزرے"۔

عالمِ واقعہ میں اللہ کے نور کے اتمام کی صورت یہ ہو گی۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول حضرت محمد ﷺ کو جو "الہدیٰ" یعنی قرآن مجید دے کر بھیجا ہے' اس کا نور عام ہو گا۔ اس عالم میں اس قرآن مجید کا چرچا ہو گا۔ محمد ﷺ اس قرآن کی مکمل طور پر تبلیغ فرمائیں گے اور اس کے ساتھ دینِ حق یعنی جو نظامِ عدل و قسط دے کر وہ بھیجے گئے ہیں' اسے قائم اور نافذ کر کے نوعِ انسانی پر اتمامِ حجت فرما دیں گے۔ اسی کے بارے میں فرمایا گیا: ﴿ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ ﴾ یعنی دین کی تکمیل اور نوعِ انسانی پر نعمتِ

خداوندی کا اتمام بعثتِ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی صورت میں ہو کر رہے گا۔

کارِ رسالت کی تکمیل کے لئے اہلِ ایمان کی ذمہ داریاں

اس کے بعد اب وہ آیت آ رہی ہے جس کا اس درس کے آغاز میں حوالہ دیا گیا تھا۔ جب اللہ کا اٹل فیصلہ یہ ہے تو اب اس کے لئے اہل ایمان کو جان اور مال کھپانا ہے۔ چنانچہ یہاں اہل ایمان کو اس کے لئے آمادہ کیا جا رہا ہے۔ کسی کو کسی کام پر آمادہ کرنے کے دو انداز ہوتے ہیں۔ ایک ترغیب و تشویق کا انداز ہے کہ یہ کرو گے تو یہ اجر ملے گا' یہ بدلہ ملے گا' یوں شاباش ملے گی' اس طرح تمہاری خدمات کا اعتراف کیا جائے گا' تمہیں ان خلعتوں سے نوازا جائے گا' اور دوسرا انداز یہ کہ اگر نہ کرو گے تو یہ سزا ملے گی۔ ان میں سے پہلا تشویق کا انداز ہے اور دوسرے کے اندر دھمکی اور وعید کا پہلو ہے۔ اس لئے پہلے کو "ترغیب" اور دوسرے کو "ترہیب" کہا جاتا ہے۔ اس سورۂ مبارکہ کے عین مرکز میں بعثتِ محمدیؐ کا مقصد معیّن ہوا ہے۔ اس کے لئے یہاں اہلِ ایمان کو جہاد کی دعوت دی جا رہی ہے اور اس کے لئے ترغیب اور ترہیب کے دونوں انداز اختیار کئے جا رہے ہیں۔ اس سورۂ مبارکہ کا پہلا رکوع بھی ترہیب پر مشتمل تھا کہ اگر دین کے تقاضوں پر عمل پیرا نہ ہو گے تو قول و عمل کے تضاد کے مرتکب گردانے جاؤ گے' اللہ تمہارے طرزِ عمل سے بیزار ہو گا اور تم اس کے غضب کے مستحق ٹھہرو گے' اور اس طرح تم گویا کہ یہود کے نقش قدم کی پیروی کرو گے جنہوں نے یہ طرزِ عمل اختیار کیا اور وہ اس مقام اور منصب سے معزول کر دیئے گئے جہاں آج تمہارا تقرر عمل میں لایا گیا ہے۔

دوسرے رکوع میں ترغیب کا انداز غالب ہے' اگرچہ اس کی ابتدا بھی ترہیب سے کی گئی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے :

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى تِجَارَةٍ تُنْجِيْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝ ﴾

"اے اہل ایمان! کیا میں تمہیں ایک ایسی تجارت بتاؤں جو تمہیں (آخرت کے) دردناک عذاب سے چھٹکارا دے دے؟"

گویا کہ یہاں یہ بات implied ہے کہ اگر تم یہ نہ کرو گے تو چھٹکارا پانے کی کوئی امید نہیں۔ اگر تم یہ سمجھے بیٹھے ہو کہ محض یہ کہنے سے کہ "ہم ایمان لے آئے" چھٹکارا ہو جائے گا تو یہ امید موہوم ہے' خیالِ خام ہے۔

سورۃ العنکبوت شروع ہوتی ہے ان الفاظ سے :

﴿ الٓمّٓ○ اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ یُّتْرَکُوْٓا اَنْ یَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَھُمْ لَا یُفْتَنُوْنَ ﴾

"کیا لوگوں نے یہ سمجھا تھا کہ انہیں چھوڑ دیا جائے گا صرف یہ کہنے سے کہ ہم ایمان لے آئے' اور انہیں آزمایا نہ جائے گا؟"

انہیں پرکھا نہ جائے گا' ان کی آزمائش نہ کی جائے گی' انہیں جانچا نہ جائے گا' انہیں امتحانوں کی بھٹیوں میں ڈالا نہ جائے گا؟ وہی بات یہاں فرمائی جا رہی ہے کہ اگر کسی نے یہ سمجھا تھا کہ محض یہ کہہ دینے سے کہ ہم ایمان لے آئے' چھٹکارا ہو جائے گا تو یہ خیالِ خام ہے۔ اگر عذابِ الیم سے چھٹکارا پانا چاہتے ہو تو ایک کاروبار کرنا پڑے گا' ایک مشقت جھیلنی پڑے گی' ایک محنت کرنی ہو گی۔

﴿ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ وَتُجَاھِدُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ بِاَمْوَالِکُمْ وَاَنْفُسِکُمْ ﴾

"(وہ یہ ہے کہ) ایمان لاؤ اللہ اور اس کے رسول پر' اور جہاد کرو اللہ کی راہ میں اپنے مالوں اور اپنی جانوں سے"۔

﴿ ذٰلِکُمْ خَیْرٌ لَّکُمْ اِنْ کُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ○ ﴾

"یہی تمہارے حق میں بہتر ہے اگر تم سمجھو"۔

اگر تم واقعی علم رکھتے ہو' اگر ہوش مند ہو' باشعور ہو' نفع اور نقصان کا صحیح فہم تمہیں حاصل ہے تو جان لو کہ یہی بہتر ہے۔ اپنی جان کا اللہ کی راہ میں دے دینا در حقیقت اس جان کو ہمیشہ کے لئے جاوداں بنا لینا ہے۔ جیسا کہ سورۃ البقرۃ میں فرمایا گیا : ﴿ وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ یُّقْتَلُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ اَمْوَاتٌ ؕ بَلْ اَحْیَآءٌ وَّلٰکِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ○ ﴾ اسی طرح اگرچہ بظاہر مال سے محبت ہے' اور اس کو جمع کر کے سینت سینت کر رکھنے کی طرف طبیعت کا میلان ہے' لیکن اگر تم حقیقت شناس اور حقیقت بین ہو تو جان لو کہ اللہ کے راستے میں'

اس کے دین کی سربلندی کے لئے اس کا کھپا دینا اور لگا دینا ہی بہتر ہے۔

مجاہدین فی سبیل اللہ کے لئے انعاماتِ ربّانی

اگلی دو آیات گویا کہ اسی آخری ٹکڑے ﴿ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴾ کی شرح ہیں' جن میں "ترغیب" کا انداز اختیار کیا گیا ہے۔ چنانچہ ان میں ایک کے بعد دوسرے انعام اور اعلیٰ مراتب کا ذکر ہے کہ اگر یہ کرو گے تو کیا کیا کچھ ملے گا۔ تو سب سے پہلے فرمایا :

﴿ يَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ﴾ "وہ تمہاری خطائیں معاف فرمائے گا"۔

یعنی اگر تم اس راستے پر قدم بڑھاتے چلو اور اس سے دامن بچا کر نکلنے کی کوشش نہ کرو' اس فرضِ منصبی کی ادائیگی سے پہلو تہی نہ ہو' تو پھر اگر کہیں کوئی لغزش یا خطا ہو بھی گئی تو اللہ کا پہلا وعدہ تو یہ ہے کہ تمہاری خطاؤں سے درگزر فرمائے گا' تمہاری غلطیوں کو معاف فرمادے گا' تمہارے گناہوں کی پردہ پوشی کرے گا۔

مزید برآں یہ کہ :

﴿ وَيُدْخِلْكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ وَمَسٰكِنَ طَيِّبَةً فِيْ جَنّٰتِ عَدْنٍ ؕ ﴾

"اور تمہیں داخل کرے گا ان باغات میں جن کے دامن میں ندیاں بہتی ہوں گی' اور ان پاکیزہ گھروں میں جو جنّاتِ عدن میں ہیں"۔

یعنی ہمیشہ باقی رہنے والے رہائشی باغات (Residential Gardens) میں تمہیں اعلیٰ مسکن عطا فرمائے گا۔

﴿ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝ ﴾ "یہ ہے اصل کامیابی!"

یہ ہے اصل فوز و فلاح۔ یعنی اصل کامیابی و کامرانی آخرت کی کامیابی ہے۔ یہ وہی مضمون ہے جو ہم پورے شد و مد (emphasis) کے ساتھ سورۃ التغابن میں پڑھ چکے ہیں۔ وہاں فرمایا گیا : ﴿ ذٰلِكَ يَوْمُ التَّغَابُنِ ﴾ "وہ ہے ہار اور جیت کے فیصلے کا دن"۔ جو اُس روز جیتا وہ جیتا' اور جو اُس روز ہارا وہ ہارا۔ جو اُس روز کامیاب قرار دیا گیا وہی کامیاب ہے اور جو اُس روز ناکام قرار پایا وہی ناکام ہے۔ چنانچہ اصل کامیابی یہی ہے'

بڑی کامیابی یہی ہے۔

نصرتِ خداوندی اور فتح قریب کا وعدہ

﴿ وَاُخْرٰی تُحِبُّوْنَهَا ﴾ "اور ایک اور چیز جو تمہیں بہت محبوب ہے"۔

یہ بڑا ہی عجیب اور قابل توجہ پیرایۂ کلام ہے۔ اللہ کے نزدیک تو اصل کامیابی وہ ہے جس کا ذکر ہو چکا' لیکن ایک اور چیز کا بھی وعدہ ہے' جو تمہیں بہت محبوب ہے' اور وہ ہے :

﴿ نَصْرٌ مِّنَ اللّٰهِ وَفَتْحٌ قَرِيْبٌ ﴾

"اللہ کی طرف سے مدد اور جلد فتح یابی"۔

یعنی اللہ کی طرف سے مدد کا وعدہ بھی ہے اور اس فتح کا بھی جو زیادہ دُور نہیں ہے۔ اب یہ مرحلہ آیا چاہتا ہے۔ اللہ کے دین کا غلبہ ہوا چاہتا ہے۔ درحقیقت اس سورۂ مبارکہ کے زمانۂ نزول کو اگر ذہن میں رکھا جائے تو ان آیات کا مفہوم صحیح طور پر سامنے آتا ہے۔ محسوس ہوتا ہے کہ یہ آیات غزوۂ احزاب کے فوراً بعد نازل ہوئیں۔ غزوۂ احزاب رسول اللہ ﷺ کی اس جدوجہد' کشمکش اور انقلابی دعوت میں ایک فیصلہ کُن موڑ (Turning Point) کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے بعد نظر آرہا تھا کہ گویا اب صورتِ حال تبدیل ہو جانے والی ہے۔ (Tables were to be turned) اس کی طرف حضور ﷺ نے غزوۂ احزاب کے فوراً بعد ان الفاظ میں ارشاد فرمایا تھا کہ : "لَنْ يَّغْزُوَكُمْ قُرَيْشٌ بَعْدَ عَامِهِمْ هٰذَا وَلٰكِنَّكُمْ تَغْزُوْنَهُمْ" یعنی اے مسلمانو! اس سال کے بعد اب قریش تم پر حملہ آور نہیں ہوں گے۔ یہ ان کی طرف سے آخری حملہ تھا' کفر کی کمر ٹوٹ چکی اور کفار حوصلہ ہار گئے' اب اقدام تمہاری طرف سے ہوگا۔ اسی کا گویا نقشہ ہے جو اِس آیۂ مبارکہ کے الفاظ میں سامنے آرہا ہے۔ اللہ کی طرف سے فتح و نصرت کے وعدے کے ساتھ فرمایا جارہا ہے :

﴿ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ ﴾

"اور (اے نبیؐ) اہل ایمان کو بشارت دے دیجئے!"

نبی اکرم ﷺ کے مذکورہ بالا فرمانِ مبارک اور اس آیۂ مبارکہ کے مابین ایک گہرا منطقی ربط معلوم ہوتا ہے اور حضورؐ کا وہ قول اغلباً ـــــ واللہ اعلم ـــــ اسی آیۂ

مبارکہ کے نزول کے بعد کی بشارت محسوس ہوتا ہے۔ یہاں فرمایا جا رہا ہے کہ اے نبیؐ! اہل ایمان کو بشارت دیجئے کہ اب وہ مرحلہ دُور نہیں ہے۔ اب اللہ کی مدد آیا چاہتی ہے اور فتح تمہارے قدم چومنے کو ہے۔ لیکن اس پورے معاملے کو "اُخْرٰی تُحِبُّوْنَهَا" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یعنی اللہ کی نگاہ میں اس کی کوئی وقعت نہیں ہے کہ تم کامیاب ہوتے ہو یا ناکام! اس کے نزدیک تو اصل کامیابی آخرت کی کامیابی ہے۔ بندۂ مؤمن کا فرض ہے کہ جو کچھ اس کے پاس ہے اسے اللہ کی راہ میں لگا دے اور اپنے تمام وسائل میدان میں لا ڈالے۔ دنیا میں وہ کامیاب ہوتا ہے یا ناکام' اس سے اس کی حقیقی کامیابی اور ناکامی کا کوئی تعلق نہیں۔ حضرت حمزہ بن عبدالمُطلب یومِ اُحد ہی کو شہید ہو گئے اور انہوں نے دین کا غلبہ اپنی نگاہوں سے نہیں دیکھا۔ انہوں نے وہ دُور نہیں دیکھا جب اللہ کے دین کا جھنڈا لہرا رہا تھا' جب محمد رسول اللہ ﷺ میدانِ عرفات یا وادیٔ منیٰ میں سوا لاکھ کے مجمع کو خطاب فرما رہے تھے۔ لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ ناکام ہوئے۔ نعوذ باللہ من ذٰلک! یہی وجہ ہے کہ یہاں ان دو وعدوں کو علیحدہ علیحدہ گروپ کیا گیا ہے۔ پہلا وعدہ خطاؤں کی بخشش اور داخلہ جنت کا ہے' جسے "اصل کامیابی" قرار دیا گیا ہے' اور دوسرا وعدہ اور خوشخبری ایک ایسی چیز کے بارے میں ہے جس کے لئے فرمایا گیا کہ "جو تمہیں بہت پسند ہے"۔ انسان بربنائے طبعِ بشری اپنی جِدّوجُہد کے نتائج کو دیکھنا چاہتا ہے' اپنی کوششوں کو کامیابی سے ہمکنار ہوتے ہوئے دیکھنے کی خواہش انسان میں فطری طور پر ہوتی ہے۔ یہاں اس کی طرف اشارہ فرما دیا گیا۔

"كُوْنُوْا اَنْصَارَ اللّٰهِ" کی پکار

اب ہم اس سورۂ مبارکہ کی آخری آیت کا مطالعہ کریں گے جو ایک طویل آیت ہے۔ اور منطقی اعتبار سے یہ اس سلسلۂ مضمون کا ایک انتہائی اہم اور بلند ترین مقام ہے جو گزشتہ آیات میں چلا آ رہا ہے۔ فرمایا:

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْٓا اَنْصَارَ اللّٰهِ ﴾

"اے اہل ایمان! اللہ کے مددگار بنو۔"

اس کا تعلق اس سورۂ مبارکہ کی پہلی آیت کے ساتھ جوڑیئے۔ وہاں فرمایا گیا تھا:

﴿ سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ ۝ ﴾ وہ زبردست ہے' کمالِ حکمت والا ہے۔ وہ غالب ہے' زبردست ہے' توانا ہے' اس کی حکومت اس پوری کائنات پر چھائی ہوئی ہے' اسے کسی کی نصرت کی کوئی احتیاج نہیں۔ وہ (معاذ اللہ) ضعیف نہیں ہے کہ اسے کسی کی مدد کی احتیاج ہو۔ بایں ہمہ اگر بندۂ مؤمن اس کے دین کے غلبے کے لئے سعی کر رہا ہو' اس کے دین کی سربلندی کے لئے جان اور مال کھپا رہا ہو' اس کے رسول کے مشن کی تکمیل کے لئے جسم و جان کی توانائیوں کو صرف کر رہا ہو' اپنے مال و اسباب اور وسائل و ذرائع کو اس راہ میں خرچ کر رہا ہو تو اللہ تعالیٰ اس کی اس حد تک حوصلہ افزائی فرماتے ہیں کہ اس کی اس جدوجہد کو اپنی نصرت سے تعبیر فرماتے ہیں۔ اور بندے کے لئے اس سے اونچا مقام اور کوئی نہیں ہے کہ مخلوق ہو کر خالق کا مددگار قرار پائے' عبد ہوتے ہوئے معبود کا مددگار قرار پائے' اور معبود اپنے بندوں سے کہے :

﴿ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْۤا اَنْصَارَ اللّٰهِ ﴾

"اے اہلِ ایمان! اللہ کے مددگار بنو!"

اس کے لئے اب یہاں تاریخ سے شواہد لائے گئے ہیں۔ بنی اسرائیل کی تاریخ جہاں بہت سی پستیوں کی امین ہے' وہاں اس میں رفعتیں بھی ہیں۔ حضرت مسیح علیہ السلام کے حواریوں نے ع "ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما" کے مصداق حضرت مسیح علیہ السلام کے رفعِ آسمانی کے بعد اُن کے پیغام کی نشر و اشاعت میں جس تندہی کے ساتھ محنتیں کی ہیں' جو کوششیں کی ہیں' جس طرح کے مصائب جھیلے ہیں' جس طرح کی صعوبتیں اور شدائد برداشت کئے ہیں' وہ واقعہ یہ ہے کہ تاریخ انسانی کا اس پہلو سے ایک بڑا درخشاں باب ہے۔ چنانچہ فرمایا گیا :

﴿ كَمَا قَالَ عِیْسَى ابْنُ مَرْیَمَ لِلْحَوَارِیّٖنَ مَنْ اَنْصَارِیْۤ اِلَى اللّٰهِ ؕ ﴾

"جیسے کہ کہا تھا عیسیٰ ابن مریم نے اپنے حواریوں سے کہ کون ہے میرا مددگار اللہ کی طرف؟"

چونکہ یہ کام اللہ کا ہے' اللہ کے دین کی تبلیغ اور اس کی نشر و اشاعت مقصود ہے لہٰذا اسے "اللہ کی طرف نصرت" سے تعبیر فرمایا۔ بعثتِ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے مقصد

اور اس کی غرض وغایت کو سامنے رکھئے تو کہا جائے گا کہ کون ہے جو اللہ کے دین کے غلبے اور اس کی سربلندی کی جدوجہد میں میرا مددگار ہو' میرا دست وبازو بنے' میرا ممدّ و معاون ہو' اس راہ میں میرا ساتھ دے؟

آپ نے دیکھا کہ ﴿ كُوْنُوْٓا اَنْصَارَ اللّٰهِ ﴾ اور ﴿ مَنْ اَنْصَارِيْٓ اِلَى اللّٰهِ ﴾ میں نصرت کی دونوں نسبتیں آگئی ہیں' ایک نسبت اللہ کی طرف اور دوسری رسول کی طرف۔ یعنی اللہ کی نصرت بایں معنی کہ دین اللہ کا ہے ـــــ اور رسولؐ کی نصرت اس حوالے سے کہ اللہ کے دین کو غالب کرنا اصلاً رسولؐ کا فرضِ منصبی ہے۔ یہ دونوں نسبتیں ہمارے منتخب نصاب کے آخری مقام سورۃ الحدید میں ان الفاظ میں بیان ہوئی ہیں : ﴿ وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ وَرُسُلَهٗ بِالْغَيْبِ ﴾ کہ اللہ دیکھنا چاہتا ہے کہ کون ہیں اس کے وہ جان نثار اور وفادار بندے جو غیب میں رہتے ہوئے اس کی اور اس کے رسولوں کی مدد کرتے ہیں۔ تو یہ نصرتِ خداوندی اور نصرتِ رُسل ہی گویا کہ جہاد فی سبیل اللہ کی اصل ماہیت' اس کی اصل حقیقت' اس کا لب لباب اور اس کا خلاصہ ہے۔ آگے "مَنْ اَنْصَارِيْٓ اِلَى اللّٰهِ" کے جواب میں حواریین مسیح کا جواب نقل ہوا ہے :

﴿ قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ ﴾ "حواریین نے کہا کہ ہم ہیں مددگار اللہ کے!"

﴿ فَاٰمَنَتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْۢ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ وَكَفَرَتْ طَّآئِفَةٌ ۚ ﴾

"پھر بنی اسرائیل میں سے ایک گروہ ایمان لایا (حضرت مسیح علیہ السلام پر) اور ایک گروہ کفر پر اڑا رہا۔"

اللہ کی تائید سے اہل ایمان کا غلبہ

﴿ فَاَيَّدْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا عَلٰى عَدُوِّهِمْ فَاَصْبَحُوْا ظٰهِرِيْنَ ۝ ﴾

"تو ہم نے تائید فرمائی ان کی جو ایمان لائے تھے ان کے دشمنوں کے مقابلے میں' اور (بالآخر) وہی غالب ہوئے!"

یہاں ﴿ فَاَصْبَحُوْا ظٰهِرِيْنَ ﴾ میں وہی لفظ "اظہار" اسم فاعل کی شکل میں آیا ہے جو ﴿ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ﴾ میں بطورِ فعل آیا تھا۔ اللہ تعالیٰ کی تائید و نصرت سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نام لیوا دنیا میں غالب ہوئے اور اللہ کے رسول کا انکار کرنے والے

یہودی مغلوب ہوئے۔ اور تاریخ میں پھر وہ اَدوار بھی آئے کہ جن میں ان کے لئے اپنا کوئی تشخص برقرار رکھنا بغیر اس کے ممکن نہیں رہا کہ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نام لیواؤں کی پناہ میں آئیں اور ان کے دامن میں اپنے آپ کو چھپائیں۔ تاریخ انسانی کے دَوران وقفے وقفے کے بعد ان پر عذابِ خداوندی کے کوڑے بھی برستے رہے۔ کبھی بخت نصر کے حملے کی صورت میں ان پر عذابِ الٰہی آیا اور کبھی ٹائٹس رومی کی صورت میں ان پر قہر خداوندی نازل ہوا۔ بیسویں صدی میں ہٹلر کے ہاتھوں ان پر قیامت ٹوٹی۔ لیکن بہرحال تاریخ کی یہ اَنمٹ شہادت ہے کہ وہ اُس وقت سے ہمیشہ مغلوب ہی رہے ہیں۔ اِس وقت بظاہر دنیا میں ان کی کچھ چلت پھرت اور کچھ حیثیت و مقام نظر آتا ہے، لیکن وہ بھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نام لیواؤں کے طفیل اور ان کے سہارے پر ہے۔ اور اگر یہ آج کچھ ناچ رہے ہیں تو انہی کے کھونٹے پر کہ جو چاہے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے صحیح معنوں میں متبعین نہیں ہیں، لیکن بہرحال ان کے نام لیوا ہیں۔

یہاں یہ سورۂ مبارکہ ختم ہوتی ہے۔ اب چند جملوں میں اس کا لُبِّ لباب ذہن نشین کر لیجئے۔ سورۂ مبارکہ کا مرکزی مضمون ہے محمدٌ رسول اللہ ﷺ کا مقصد بعثت اور اس کی تکمیلی اور امتیازی شان، یعنی وہ دینِ حق جو آپؐ دے کر بھیجے گئے اسے پورے نظامِ زندگی پر بالفعل قائم کرنا، غالب کرنا، رائج کرنا، نافذ کرنا۔ اور وہ جو ایمان رکھتے ہوں اللہ پر اور ایمان رکھتے ہوں محمد ﷺ پر، ان کا فرضِ منصبی ہے اس مقصد کیلئے جان اور مال کے ساتھ جہاد کرنا۔ وہ اگر یہ کرتے ہیں تو ان کیلئے سب کچھ ہے، مغفرت بھی ہے اور ہمیشہ رہنے والے رہائشی باغات میں ان کو بہترین ٹھکانے بھی میسر آجائیں گے۔ ان پر اللہ کی طرف سے انعام و اکرام اور اعزاز کی بارش ہوگی۔ پھر یہ کہ مزید اس دنیا میں بھی نصرت اور فتح کے وعدے ہیں۔ اور مزید برآں یہ کہ ان کی اس طرح قدر افزائی ہوگی اور وہ بلند مقام انہیں ملے گا کہ وہ اللہ اور اس کے رسول کے مددگار قرار پائیں گے۔ اور اگر نہیں کرتے ہیں تو عذابِ الیم سے چھٹکارا پانے کی امید بھی موہوم ہے، بلکہ یہ اللہ کے غضب کو بھڑکا دینے والی بات ہے کہ انسان زبان سے دعوائے ایمان کرے، اللہ اور اس کے رسول کو ماننے کا اقرار کرے اور بالفعل اس کے تقاضوں کو پورا کرنے سے انکار کر دے!!